جلد ۱۱۱ جون ۱۹۸۹ء عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

فہرست مضامین

عدد ۴	جون ۱۹۸۹ء مطابق ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ	جلد ۱۱۱

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

رابطہ کے لیے: ادارہ ترجمان القرآن، رحمٰن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار

فون نمبر ——— ۳۲۴۴۶۸

زر سالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

حالات کی گردشیں روز بروز زیادہ پریشان کرنے لگی ہیں۔ مسائل چاروں طرف سے سانپوں کی طرح اٹھ رہے ہیں اور ان کو حل کرنے والی اصل قوت خود ہی ان کی پرورش و نشوونما کا باعث بھی سمجھی جاتی ہے۔ ان حالات میں جمہوریت کی پیدا کردہ بے بسی کو دیکھتے ہیں تو خیال ہوتا ہے کہ ہم نے بچپن سے لے کر دورِ مطالعہ و تفکر اور دورِ تجربہ تک جس چیز کو جمہوریت کے نام سے جانا وہ زمین کے بعض گوشوں میں یا آسمان پر یا خواب و خیال میں پائی جاتی ہوگی مگر عملاً جو شاندار جمہوریت ہمیں دکھ جھیل جھیل کر اور سعی و جہد کی منزلوں سے گذر کر حاصل ہوئی ہے وہ تو ایک مضبوط قفسِ بے بسی کے سوا کچھ نہیں۔ ہم اس قفسِ بے بسی میں پڑے اپنی شامتِ اعمال اور خرابئ احوال کو دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ملک اور دین کے ساتھ اور عوام کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، مگر ہم قفس سے باہر نہیں آسکتے، بول نہیں سکتے، شکایت اور فریاد نہیں کر سکتے، تڑپ اور پھڑپھڑا نہیں سکتے، ورنہ ہمارے نگران ہمیں مخالفینِ جمہوریت قرار دے کر معتوب اور بدنام کر دیں گے۔ ان کے پاس قانون ہیں، قانون سے بالاتر اختیاراتِ تمیزی ہیں، ذرائع ابلاغ ہیں، جھوٹ کو سچ کا نت نیا لباس پہنانے والے درزی ہیں، پولیس اور عدالتیں اور جیل خانے ہیں۔

اس بات کا کیا علاج کہ امریکہ نے یہودیوں کے ذریعے ہماری گردن کو گرفت میں لے لیا

ہے۔ سامراجی قوتیں اور مخالفانہ مداخلتیں کرنے والی حکومتیں بالعموم کسی قوم کے اندر کے کسی چھوٹے موٹے ادارے یا کچھ جاسوس اور تخریب کار افراد کو دولت یا سازش کے جال میں پھانس کر کچھ نہ کچھ گڑبڑ کراتی رہتی تھیں، یا کچھ راز اڑا لیتی ہیں۔ مگر امریکہ نے تو کمال کر دیا کہ سرے سے بزمِ اقتدار کی چوٹی ہی سر کر لی ہے۔ پاکستان کی شان ہمیشہ ہر معاملے میں نرالی ہی رہتی ہے۔ اور یہ نرالا پن تو یادگار رہے گا، مگر معلوم نہیں کہ ہم اسے یاد کرنے اور اس پر پچھتانے کو ہوں گے بھی یا نہیں۔ ایک لمبا دور ایسا گذرا ہے کہ پاکستان میں یہودیوں کا داخلہ بند تھا اور ان کو نہ کوئی منصب مل سکتا تھا، نہ وہ پاکستانی نظامِ حکومت یا سیاست یا پالیسیوں یا مالیات میں کوئی دخل دے سکتے تھے۔ بیچ میں کچھ لوگ چوری چھپے آئے اور دو ایک صورتوں میں حکومت نے استثنائی طور پر بعض وقتی صورتیں گوارا کیں۔ مگر کسی کا مستقل دخل نہ ہو سکا۔ لیکن اب تو یہودیوں نے پیپلز پارٹی کی انتخابی مہم پاکستان میں چلوانے کے لیے رہنمائی اور مدد دی۔ سارا یہودی پریس اس مہم میں لگ گیا۔ اور مغرب کے تمام ذرائع ابلاغ کو استعمال کرنے کے لیے معاملہ طے ہو گیا۔ اب بات آگے بڑھی ہے کہ بے نظیر صاحبہ نے پاکستان کی نمائندگی کے صہیونی ماہر سیاست مارک سیگل سے معاہدہ کر لیا ہے۔ اسرائیل کے ایجنٹ کو بے نظیر کے دورہِ امریکہ کا انچارج اور پاکستان کا سفارتی نمائندہ ہونے کی سعادت ملی ہے۔ مارک سیگل اور سٹیفن سولارز ہماری گردنوں پر اس طرح سوار ہو گئے ہیں کہ اس کے دوسرے معنی پاکستان کے اسرائیل کے تسلط میں چلے جانے کے ہیں۔ مزید افراد کا ذکر کرنے کی گنجائش نہیں۔ اب ہم اپنی حکومت کے واسطے سے قومی طور پر اسرائیل نواز اور صہیونیت پرور ہیں۔ ہم ان لوگوں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں ہیں جن کی پوری تاریخ مسلم مقاصد اور عرب مفاد کے خلاف پروان چڑھی ہے۔ آج اسلام کے دشمن اور عربوں کے بیری اور فلسطینیوں کے قاتلوں کو ہم نے اپنا قسمت گر بنا لیا ہے۔

جمہوریت کے عطا کردہ اس یہودی تسلط کے بعد بھارت کی طرف نگاہ کیجیے غیر جانبدا

ملکوں کے سربراہوں کی کانفرنس کے موقع پر ہی بھارت نے علی الاعلان بازی جیت لی، اور پاکستانی قوم کا سر افتخار خطِ مذلت تک جھکا دیا گیا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ سامنے آرہا ہے کہ کہوٹہ پلانٹ میں یورینیم کی افزودگی اور ایٹمی طاقت کے انضباط کے لیے جو کام ہو رہا ہے، وہ رُک گیا ہے۔ یہ خبر چاردانگ عالم میں ریڈیو بہ ریڈیو، اخبار بہ اخبار گونجتی چلی جا رہی ہے۔ ہم صرف اس نشے میں مگن ہیں کہ ہمیں جمہوریت مل گئی ہے، جی ہاں جمہوریت کو خوب چاٹیئے اور چوسیئے۔

اب تو دشمن کے نئے میزائیلوں نے نیا چیلنج پیدا کر دیا ہے۔

پھر جو اطلاع احتیاط کے بند دروازوں کے شگافوں سے باہر آگئی ہے، وہ یہ ہے کہ سیاچن پر اتنی قربانیاں دینے کے بعد اب بات یوں طے ہونے والی ہے کہ سیاچن انسانی ملکیت سے آزاد ہے۔ (NO MAN'S LORD) نہ بھارت کا حق، نہ پاکستان کا حق۔ یعنی آپ کے گھر پر کوئی حملہ کر دے اور اس کا بچاؤ کرنے کے لیے قربانیاں دینی پڑیں تو جان چھڑانے کے لیے ہم یہ راہ نکال لیں کہ اچھا "نہ گھر تیرا، نہ گھر میرا" لہٰذا لڑائی ختم۔ اب جس کا وہ تھا ہی نہیں اُس کا تو کچھ بھی نہیں گیا، اور جس کا دراصل تھا اس کا سب کچھ گیا۔ کیا خوب سودا ہے۔

بھارت کے حملے سے پہلے یہ گلیشیر پاکستانی حصے میں محسوب تھا۔ مگر رُوسی فوجوں نے جب واخان پر قبضہ کیا اور بھارت کے سامنے یہ صورت آئی کہ چین اور پاکستان کا رابطہ کاٹنے (ہوائی بھی اور شاہراہِ ریشم سے بھی) اور رُوس سے متحد ہو کر جنگِ جوع الارض لڑنے، نیز جنوبی ایشیا پر اپنی برتری کا جھنڈا گاڑنے کے لیے سیاچن کے اُوپر سے راستہ بنانا ضروری ہے۔ چپکے سے بلکہ چوروں کی طرح بھارت نے یہ ایڈونچر شروع کر دیا۔ پاکستانی کتنی ہی مشکلات رکھتے ہوں، نرے مٹی کے مادھو تو نہیں ہیں، انہوں نے بھارتی ایڈونچر کا حال معلوم کر لیا اور گلیشیر پر مقابلے کے لیے پہنچ گئے۔ بھارت نے کئی سال پہلے سے تیاریاں کی تھیں، اپنے آدمی قطب جنوبی میں بھیج کر اُن کو انتہائی سردی کا تجربہ کرایا، بہترین قسم کے لباس، وردیاں اور خیمے اور اوڑھنے بچھانے کے سامان

جمع کیے۔ شدید سرد مقامات کی بیماریوں اور فوری حادثات پر اپنے ڈاکٹروں کو تیار کرایا۔ خاص قسم کے ہیلی کاپٹر لیے۔ ہمارے پاکستانی بے سروسامانی کے باوجود اللہ اکبر کہہ کر مقابلے پر ڈٹ گئے۔ یہاں تک کہ حال ہی میں بھارتی فوجیوں کی چیں بول گئی۔ مگر اب ہندو نواز امریکہ اور سوویت یونین کے یہودی ماہرین نے سیاچین گلیشیئر کو "نو مین لینڈ" بنانے کا عیارانہ حربہ اختیار کر لیا ہے۔ اس طرح بھارت کو ذلت سے بھی بچایا جا سکتا ہے، اور پاکستان کو سیاچن سے مستقلاً محروم بھی کیا جا سکتا ہے تاکہ پھر کبھی وہ نام بھی نہ لے سکے۔ ایسے ہیں ہمارے کارساز اور دلنواز!

اُدھر بھارت نے سندھ کی میٹنگ لینے کے سامان لمبے عرصے سے کر لیے ہیں۔ آبادی کے مختلف عناصر کو لڑوا دیا ہے۔ عام سطح پر ڈاکوؤں نے قانون کو یرغمال بنا لیا ہے، اور یونیورسٹیوں، کاروباری معاملوں، نفع اندوزیوں، نیز مسلمانوں میں خلافِ اسلام لٹریچر کی بھارت میں تیاری کا کام لیڈروں نے سنبھال لیا ہے، اور یہی خادمانِ سندھ جاسوسی اور غلط افراد کو لانے اور لے جانے کا کام بھی کرتے ہیں۔ اب وہاں دست بدست لڑائی اور خانہ جنگی ہے۔ اور لاڑکانہ میں المرتضیٰ کی حفاظت کے لیے مشین گنیں اور دیگر بھارتی اسلحہ فٹ کر دیا گیا ہے۔ یہ ہے سندھ کی محبوب عوامی حکومت!

سارے علاقہ پر برتری کا سکہ چلانے کی ہوس کا مارا ہوا بھارت اپنے جنون کی رو میں ڈھائی ہزار میل تک پھینکا جانے والا اگنی بم تجربے میں لا چکا ہے۔ اور امریکہ اپنے ہونہار شاگرد کی اس ترقی و کامیابی پر وجد میں آکر ہمیں بھارت کی طرف سے ہمدردانہ انداز میں دھمکی دے رہا ہے کہ بھارت کسی وقت بھی پاکستان پر حملہ کر سکتا ہے۔ یعنی بھارت کو تھپکی دے کر ہشکا بھی دیا گیا ہے اور پاکستان کی کارفرما قوت کو یہ بھی سبق دے دیا گیا ہے کہ اگر تحفظ درکار ہو تو ہماری خدمات راجیو، بے نظیر دوستی کے لیے حاضر ہیں اور یہی ہدفِ مقصود اس وقت سامنے ہے جیسا کہ مصر کے لیے کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے کا قصہ تھا۔

ادھر یہی بھارت اپنی فوجی قوت کابل کی روس پرست نجیب حکومت کو فراہم کر رہا ہے

جس سے اس کے دو بہرے مقصد ہیں۔ ایک یہ کہ افغان مجاہدین کی قربانیوں کا نتیجہ اسلامی حکومت کی شکل میں بر آمد نہ ہوسکے، جو بھارت کے مفاد کے خلاف ہے۔ دوسرے کوئی ایسی افغان حکومت نہ بنے جو پاکستان کو دوستانہ تعاون فراہم کر سکے۔ یہی باتیں روس اور امریکہ اور اسرائیل بھی چاہتے ہیں بلکہ پورا مغرب۔ اور کئی مسلمان بھی ان کے ہم نوا ہیں۔ خود پاکستان میں بھی۔ پہلے دبے دبے تھے۔ اب بے نظیر حکومت میں اچھل اچھل کر بات کرتے ہیں۔ یہ ایسے مسلمان ہیں جن کو اسلام کے نصب العین اور مسلمانوں کے مقاصد اور ان کی ضروریات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ان کو پروا نہیں ہے کہ پاکستان کی ۸، ۹ سالہ دوستی اور سرگرم تعاون کی قیمت ایک دن میں ختم ہوسکتی ہے۔ علاوہ ازیں اگر افغانستان میں سنی اسٹیٹ نہیں بنتی تو پھر پاکستان کو اپنے حالات پر نگاہ رکھنی چاہیے کہ یہاں ایسی قوتیں اور ادارے جمع ہو رہے ہیں اور ایسا پروپیگنڈا جاری ہے، اور ایک شیعی نقطۂ نظر کے شاہی خاندان کے سائے میں ان کو اہم شعبوں میں بڑی بڑی جگہیں، نیز ان کی تعداد کے تناسب سے بہت زیادہ مواقع سول سروس اور مالی اداروں اور سرکاری اور نیم سرکاری کاروباری تنظیموں اور ذرائع ابلاغ کے اندر مل رہے ہیں —— نیز خمینی ازم کا پروپیگنڈا مختلف طریقوں سے زوروں پر ہے —— ان ساری چیزوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک لبرل مگر کتاب وسنت کے مطابق اسلامی جمہوری اسٹیٹ کے بجائے یہاں کے لوگ ایک دن اثنا عشری حکومت کے شکنجے میں کسے پڑے ہوں گے[1]

یہ سب مغربی اور بھارتی اور روسی سازشوں کے نتائج ہوسکتے ہیں۔

اور ہم اپنے ظاہری طنطنے کے باوجود "ہز ماسٹرز وائس" قسم کے مسکین مزاج لوگ ہیں کہ ہم کسی خاص مستقبل کو آتا دیکھ کر پہلے سے سر جھکانے اور سواری بننے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ کل اگر مہاراجہ رنجیت سنگھ اور گورنر جنرل برطانیہ نے ہم پر سواری کی تھی تو

---

[1] خیال رہے کہ قادیانی اور دوسری تمام اقلیتیں احیائے اسلام کے خلاف ہیں۔ اسی لیے حالیہ ضمنی انتخاب میں چترال میں ووٹ پی پی پی کو ملے۔

آج کیوں گورباچوف اور جارج بُش اور سٹیفن سالارز اور راجیو اور نجیب اور ولی خاں کو حق نہیں ہے کہ وہ ہماری بیٹھوں پر زین کسیں اور ہنٹر ہاتھ میں لے کر ہمیں لہولہان کر دیں اور ہمیں جہاں چاہیں گھماتے پھریں۔ شاید ہنٹر کھا کر ہماری خودی بیدار ہو سکے۔

چنانچہ ہماری ترجمانِ اعلیٰ فرما رہی ہیں کہ مسئلہ افغانستان کا فوجی اور جنگی طریقوں سے حل ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کا حل ایک وسیع البنیاد حکومت ہے جس میں سرفروش اور جانباز مجاہدین اور نجیب اور خلقی اور پرچمی کمیونسٹ ـــ بلکہ قاتل اور مقتول ایک سطح پہ مل کر، دوش بدوش یا آمنے سامنے بیٹھیں۔ اور تمام جہاد اور قربانیوں اور پاکستان کی مساعیٔ تعاون وخدمت پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا جائے۔ اس طرح خطِ تنسیخ کھینچنے میں یہ اندیشہ بھی ہے کہ ہم خود اپنے ہی وجود پر خطِ نسخ نہ کھینچ دیں۔

ملک میں داخلی طور پر ایک ضروری کارنامہ یہ ہو رہا ہے کہ فوج کے خصوصی ادارۂ مخابرات وانکشافات کا قلع شریف ہو جائے۔ امریکہ کا سی آئی اے، روس کا کے جے بی، بھارت کا "را" اور کابل کا خاد تو خوب کام کرتے رہیں اور پاکستان بھی ان کی سیرگاہِ عام ہو، لیکن پاکستان کی فوج کو حق نہیں ہے کہ وہ آس پاس کے دشمنوں کی فوجی اسکیموں، کارروائیوں، منصوبوں اور نقل وحرکت سے آگاہی حاصل کرنے کا انتظام رکھیں ـــ دوسرے لفظوں میں فوج کے ہاتھ پاؤں باندھ کر دشمنوں سے اسے مروایا جائے اور پھر یہاں کوئی سرمایۂ افتخار باقی نہ رہے۔ یہ بھی روس، امریکہ، اسرائیل، بھارت اور کابل کی مشترکہ آرزو ہے۔

ایک معرکہ سابق صدر ضیا الحق کے خلاف اس اصول پہ لڑا جا رہا ہے کہ ہر خرابی کا ذمہ دار ضیا الحق کا ۱۱ سالہ دور ہے۔ بجلی غائب تو وجہ گیارہ سالہ دور، گندم کم تو وجہ گیارہ سالہ دور، جرائم کی کثرت تو ذمہ دار گیارہ سالہ دور، اقتصادی لوٹ مار ہو رہی ہے تو اس کا باعث گیارہ سالہ دور۔

دوسرا معرکہ پنجاب کی منتخب اکثریتی حکومت کے خلاف۔ ہر معاملہ میں جھگڑا، ہر معاملے میں اختلاف، ہر معاملے میں الزام دہی، بڑے بڑے دماغ اسی معرکۂ تعمیرِ قوم میں مصروف

ہیں۔ واہ ری بی جمہوریت!

ایک حملہ آٹھویں ترمیم کے خلاف چل رہا ہے۔ پوچھیئے کہ کچھ کام نہیں ہوا تو جواب کہ آٹھویں ترمیم حائل ہے۔ سوال کریں کہ بے روزگاری بہت ہے۔ جواب آٹھویں ترمیم کی وجہ سے ہے۔ پوچھیے کہ حکومتوں اور پارٹیوں میں اتنا افتراق ہے۔ جواب آٹھویں ترمیم کے نتائج ہیں۔

ایک خدمت یہ بھی ہو رہی ہے کہ تمام نوکریاں اور رمفاد اور مواقع اپنے خاندان اور اس کے بعد اپنی پارٹی کے قدموں میں ڈالے جا رہے ہیں۔ باقی لوگ چاہے کتنے ہی خستہ و خراب ہوں، پارٹی کا جھنڈا بلند رکھنے والے، خزانے سے فیض پائیں۔ اسی طرح وزیروں، مشیروں کا نوج ظفر موج جس کی وسعت حکومت کی کمزوری کا نشان ہے، خزانے کا بڑا حصہ صاف کر رہی ہے۔ باقی کسر پارٹی کے وفادار پارلیمانی ممبران میں روپے کے ذریعے میدان ہموار کرنے کے فریضہ پر مقرر کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ زکوٰۃ پارٹی کے غیر حکومتی افراد تقسیم کریں۔ اور پیپلز پروگرام کو بھی وہی چلائیں۔ کیا اس کا نام جمہوریت ہوتا ہے؟ کس ڈکشنری میں! کس نمونے کی مشہور جمہوریت کے دستور میں؟

عام افواہ یہ بھی ہے کہ پارٹی کے اکابر سرمایہ باہر بھی بھیج رہے ہیں۔ نوٹ کثرت سے چھاپے گئے ہیں۔ افراطِ زر نمایاں طور پر بڑھ گئی ہے جس کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ روپے کی قیمت گر گئی ہے۔ شاید ضیاء الحق کے گیارہ سالہ دور اور حکومتِ پنجاب کی روش اور آٹھویں ترمیم کے برقرار رہنے کے باعث!

مزید آفت دماغوں کا گودا چاٹ لینے والی وہ گرانی ہے جس کا سب سے زیادہ اثر حکومتی اداروں کے بلوں میں نمایاں ہوا ہے۔ سو سے کم مقدار میں آنے والے بجلی کے بل یکایک تین ساڑھے تین سو تک پہنچ گئے ہیں۔ حکومت کی طرف سے ابھی بجٹ کی بارانِ کرم ہونے والی ہے۔ جس میں ٹیکسوں کی بڑھوتری اور گرانی کے مزید اضافے کی ژالہ باری کا اندیشہ سامنے دکھائی دے رہا ہے۔ مالیات اور قیمتوں کا یہ سارا سسٹم ہمارے ان آقاؤں کے اشارہ ابرو سے ہے جو قرض دے کر اس مقام پہ آ گئے ہیں،

جس پر پرانا ہندو مہاجن چوہدری صاحب اور نواب صاحب کے گلے میں سود کی رسی ڈال کر آ جایا کرتا تھا۔ یہ ہماری جمہوری حکومت کے اوپر ایک غیر سیاسی حکومت ہے۔

ٹیلی وژن اور ثقافتی ادارے قوم کو ناچ گانوں اور فواحش کی چاٹ لگا کر اُس تباہی و ہلاکت سے غافل رکھنا چاہتے ہیں جو سروں پر معلق ہے، بلکہ کہیں کہیں اس کے ابتدائی آثار عملاً بڑی دردناک صورتوں میں سامنے ہیں۔

حالات کی یہ تصویر پوری صراحت سے نہ قوم کی سیاسی قیادت اس کے سامنے پیش کر رہی ہے، نہ علماء امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ والے مرتبۂ بلند پر فائز ہو کر پیش آمدہ حالات کے متعلق گواہی دے رہے ہیں (جو سمجھ ہی نہ پا رہے ہوں، وہ شاید عنداللہ کچھ رعایت پالیں)۔ اسی طرح ذرائع ابلاغ میں سے ٹیلی وژن، بائیں بازو کے دانشوروں کے زیرِ نگیں حکمران پارٹی کے راگ سُنا رہا ہے۔ اور مِس ثقافت کو نچوا رہا ہے یا مذہب و اخلاق کا خاکہ اُڑا رہا ہے۔ ریڈیو ملے جلے پروگرام دے رہا ہے، مگر اپوزیشن کے لیے دروازہ بند۔ اور اسلام برکت کی حد تک۔ اخبارات میں قوم کو اصل دردناک مسئلے سے آگاہ کرنے کا سامان ناپید۔ کچھ متفرق اشارات، مگر ان کے ساتھ ایسے شذرے اور ایسی بحثیں اور ایسی رپورٹیں کہ وہ اشارات ملبے میں دب جاتے ہیں۔ اور قوم کے مجرم جرائم میں محو ہیں، خیانت کار اپنی کمائی کر رہے ہیں، عمارتیں بن رہی ہیں، عیش و طرب ہو رہا ہے، کچھ لوگ کُڑھتے پِٹتے اور پھر روتے فریاد کرتے ہیں۔ باقی عوام ہکا بکا ہو کر دیکھ رہے ہیں، ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ وہ گویا انتظار کر رہے ہیں کہ آوازۂ حق اُٹھتا ہے کب اور کدھر سے!

بزرگو اور بھائیو اور عزیز نوجوانو! قرآن اور حدیث پڑھ کر پھر حالات کا جائزہ لو، ہمارے سامنے عذاب کی علامات آ رہی ہیں۔ اگر دعاؤں اور اعمال کی شکل میں باہمی محبت اور پاکستان کی خیر خواہی اور غلبۂ اسلام کے لیے کچھ کر سکو تو شاید خدا بچا لے!

حکمت سیّد مودودیؒ

اِسلامی انقلاب کے دو بنیادی لوازم

(۱)

اسلامی انقلاب کے مقصد کے لیے کام کرنے والوں کو عوام میں اپنی دعوت پھیلانی چاہیے تاکہ عام لوگوں کی جہالت دُور ہو اور وہ اسلام سے واقف ہوں اور اسلام و جاہلیت کا فرق جان لیں۔ اس کے ساتھ انہیں عوام کی اخلاقی اصلاح کی بھی کوشش کرنی چاہیے اور فسق و فجور کے اس سیلاب کو روکنے کے لیے اپنا پورا زور لگا دینا چاہیے، جو فاسق قیادت کے اثر سے مسلمان قوموں میں روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک قوم فاسق ہو جانے کے بعد ایک اسلامی حکومت کی رعایا بننے کے قابل نہیں رہتی۔ عامۃ الناس میں فسق جتنا بڑھے گا اُن کے معاشرے میں اسلامی نظام کا چلنا اتنا ہی مشکل ہوتا چلا جائے گا۔ جھوٹے، بددیانت اور بدکار لوگ نظامِ کفر کے لیے جتنے موزوں ہیں، نظامِ اسلامی کے لیے اتنے ہی غیر موزوں ہیں۔

(۲)

بے صبر ہو کر خام بنیادوں پر جلدی سے کوئی اسلامی انقلاب برپا کر دینے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ جو مقصد ہمارے پیش نظر ہے اس کے لیے بڑا صبر درکار ہے۔ حکمت

کے ساتھ جانچ تول کر ایک ایک قدم اٹھائیے اور دوسرا قدم اٹھانے سے پہلے خوب اطمینان کر لیجیے کہ پہلے قدم میں جو نتائج آپ نے حاصل کئے ہیں وہ مستحکم ہو چکے ہیں، جلد بازی میں جو پیش قدمی بھی ہو گی اس میں فائدے کی بہ نسبت نقصان کا خطرہ زیادہ ہو گا۔ مثال کے طور پر فاسق قیادت کے ساتھ شریک ہو کر یہ امید کی جاتی ہے کہ شاید اس طرح منزلِ مقصود تک پہنچنے کا راستہ آسان ہو جائے گا" اور کچھ نہ کچھ اپنے مقصد کے لیے مفید کام بھی ہو سکے گا۔ لیکن عملی تجربہ بتاتا ہے کہ اس لالچ سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا، کیونکہ دراصل زمامِ امر جن لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے وہ اپنی ہی پالیسی چلاتے ہیں۔ اور اُن کے ساتھ لگنے والوں کو ہر قدم پر ان سے مصالحتیں کرنی پڑتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ آخر کار بس اُن کے آلۂ کار بن کر رہ جاتے ہیں۔

تصحیح (شمارہ اپریل)

ص ۲۹ سطر ۳ قِیَامَ لَیْلَۂ کے بجائے قِیَامَ لَیْلِہٖ

ص ۳۱ سطر ۱۰ مَنْ فَطَرَ " " مَنْ فَطَّرَ

شَھْرُ الْمُوَاسَاۃِ " " شَھْرُ الْمُوَاسَاۃِ

ص ۳۵ - آخری سطر وَامْتَلَتِ الْعُرُوْقَ " " وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ

(حسبِ توجہ دہانی جناب نور الٰہی ایڈووکیٹ گجرات)

تصحیح

رسالہ ترجمان القرآن جلد ۱۱۱ عدد ۳ - ص ۱۴۵/۳۴ سطر ۸ میں ۱۹۷۶ء کے بجائے اپریل ۱۹۷۸ء پڑھا جائے۔

(ادارہ)

عورت کی حکمرانی قرآن و سُنّت کی روشنی میں

مولانا گوہر رحمٰن صاحب - مردان

(۳)

۵- غیر مسلم خواتین کی حکومتوں کو سندِ جواز بنانا

تاریخ کے ایک پروفیسر صاحب نے کہا ہے کہ حدیثِ رسولؐ لن یُفلح قوم الخ کا اطلاق صرف ایران کی ملکہ پوران دخت پر ہوتا ہے۔ کوئی عام حکم نہیں ہے اِس لیے کہ ملکہ وکٹوریہ، ملکہ الزبتھ، ملکہ رین اور دوسری متعدد خواتین نے کامیاب حکومتیں کی ہیں۔ اگر اس حدیث کو قاعدہ کلیہ بنا دیا جائے تو پھر اس کی صحت مشکوک ہو جائے گی۔

جواب

۱- قاعدہ یہ ہے کہ قرآن و حدیث کی نصوص میں شانِ نزول اور شانِ ورود کے خاص ہونے کا لحاظ نہیں ہوتا، بلکہ الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے۔ قرآن کی کئی آیات مشرکینِ مکہ، اور یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی تھیں لیکن ان کا حکم عام ہے اور جو بھی ان آیات کا مصداق بن سکتا ہو ان پر یہ آیات منطبق ہوتی ہیں۔

۲- اگر یہ پیشین گوئی عام نہ ہوتی تو الفاظ یوں ہوتے۔ لَنْ یُّفْلِحُوا اذ ولّوا امرھم امرأۃ- "یہ ایرانی ہرگز کامیاب نہ ہوں گے جب کہ ایک عورت کو انھوں نے اپنا سربراہ بنا دیا ہے"۔ لیکن الفاظ یہ نہیں ہیں بلکہ یوں ہیں: لن یفلح قومٌ وَلّوا امرھم امرأۃ

ہرگز کامیاب نہ ہوگی ہر وہ قوم جس نے کسی بھی عورت کو اپنا حکمران بنا دیا ہو۔" قومٌ کا لفظ نکرہ ہے جس پر حرفِ نفی لَنْ داخل ہوا ہے جو عربی قاعدے کی رُو سے عموم کے لیے اور تاکید و تابید کے لیے آتا ہے اور اِمْرَأۃ کا لفظ بھی نکرہ ہے جو عموم کے لیے آتا ہے۔ یعنی یہ ایک عام اور تاکیدی اور اَبَدی پیشین گوئی ہے۔ اگرچہ اس کا شانِ ورود پوران دخت ہے۔ مگر یہ اسی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اور مذمت کی علت ایرانی ہونا نہیں ہے بلکہ "تَوْلِیَۃُ اِمْرَأۃ" یعنی عورت کو حکمران بنانا اصل علت بیان کی گئی ہے۔ علت اگر عام ہو تو حکم بھی عام ہوتا ہے۔ عربی زبان کا معمولی سا ذوق رکھنے والا شخص بھی ان قواعد سے واقف ہوتا ہے۔ مگر معلوم نہیں ہمارے اس پروفیسر کی نظر ان قواعد پر کیوں نہیں پڑی؟ یا انھوں نے دانستہ طور پر ان سے صرفِ نظر کر لیا ہوگا۔ واللہ اعلم۔

۳۔ باقی رہی یہ بات کہ کیتھرائن اور ملکہ وکٹوریہ جیسی خواتین نے کامیاب حکومتیں کی ہیں تو اگر کامیابی اور فلاح کے معنی یہی ہیں کہ فتوحات حاصل کی جائیں اور معاشی طور پر ترقی کی جائے تو پھر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ غیر مسلم کی حکومت بھی جائز ہے اور کامیاب ہے۔ درآنحالیکہ قرآن و سنت کی صریح نصوص سے ثابت ہے کہ کافر اور ظالم حکمرانی کے شرعاً مستحق نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کامیابی اور فلاح کا اسلامی تصور یہ ہے کہ ایسا پاکیزہ معاشرہ قائم کیا جائے جس میں عدل و انصاف کی حکمرانی ہو۔ اس کے علاوہ حقیقی کامیابی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مستقبل روشن اور خوشحال ہو۔ حال کی خوشحالی اگر مستقبل کی بربادی کا ذریعہ بن جائے تو یہ کامیابی نہیں ہوتی، بلکہ ناکامی اور نامرادی ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ اصل مستقبل موت کے بعد شروع ہوتا ہے۔ حکومت تو فرعون اور نمرود نے بھی کی تھی اور بڑی مضبوط حکومت کی تھی تو کیا ان کی یہ حکومتیں بھی کامیاب تھیں اور شرعاً جائز تھیں؟ "حکومت بالحق" اور "حکومت بالفعل" کے درمیان فرق کو اگر ملحوظ نہ رکھا جائے تو اس سے بہت سے ایسے سوالات سامنے آجائیں گے جن کا حل کرنا مشکل ہوگا۔

۴۔ اِس حدیث کو ہر دَور کے محدثین اور فقہا نے عورت کی حکمرانی کے عدمِ جواز کی دلیل قرار دیا ہے۔ امام ابوسلیمان خطابیؒ نے لکھا: فی الحدیث ان المرأۃ

لا تلی الامارۃ ؎

یعنی "اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت حکمران نہیں بن سکتی۔" اس کے علاوہ ابن حجرؒ، بدرالدین عینیؒ، ابن حزمؒ، ابن عربیؒ، ابن کثیرؒ، قرطبیؒ، ابن الھمامؒ، قاضی ثناءاللہؒ، شاہ ولی اللہؒ، قاضی شوکانیؒ اور مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری نے بھی اس حدیث کو عام سمجھا ہے اور عورت کی حکمرانی کے عدم جواز کی دلیل قرار دیا ہے۔ جدید دور کے علماء مثلاً مولانا مودودیؒ، مفتی محمد شفیعؒ اور مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ نے بھی حدیث کو عام قرار دیا ہے اور اسے دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ اگر آج سپریم کورٹ کے چھ سات جج آئین کی کسی دفعہ کی تعبیر کا فیصلہ سنا دیں اور کوئی تاریخ دان اس تعبیر کو غلط قرار دے تو لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے۔ مگر پندرھویں صدی کا یہ پروفیسر چودہ سو (۱۴۰۰) سال سے مسلسل نقل ہونے والی اس تعبیر و تشریح کو درایت کے خلاف قرار دے کر بڑی ڈھٹائی سے رد کر رہا ہے۔

ع ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے!

الائمۃ من قریش کو نظیر بنانا

پنجاب یونیورسٹی کے اس تاریخ دان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو کہ "حکمران قریش میں سے ہوں گے۔" بطور نظیر پیش کیا ہے کہ اس خبر کے باوجود ترکوں کی خلافت قائم ہوئی تھی جو قریش نہیں ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں صرف خبر دی گئی ہے، کوئی قاعدہ کلیہ بیان نہیں ہوا کہ ہمیشہ کے لیے خلافت قریش ہی کا حق ہے۔ اسی طرح رسول اللہؐ کے اس ارشاد میں کہ "ہرگز کامیاب نہیں ہوگی وہ قوم جس نے عورت کو اپنا حکمران بنا دیا ہو"۔ کوئی عام اور کلی حکم بیان نہیں ہوا۔ بلکہ صرف ایک خبر دی گئی ہے جو پوران وخت کے ساتھ مخصوص ہے۔

؎ فتح الباری شرح بخاری جلد ۹ صفحہ ۱۶۷ و عمدۃ القاری جلد ۱۸ صفحہ ۵۹ کتاب المغازی۔

جواب

قریش کی حکومت کے بارے میں یہ پیشین گوئی مشروط ہے۔ صحیح مسلم میں فرمان نبوی نقل ہوا ہے کہ:

مَآ اَقَامُوا الدِّیْنَ اور مَا حَکَمُوْا فَعَدَلُوْا

"یعنی قریش اُسی وقت تک حکمران رہیں گے جب تک کہ وہ دین کو قائم کریں گے اور عدل کے ساتھ فیصلے کریں گے۔"

اِس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ الائمۃ من قریش کا مفہوم یہ ہے کہ قریش جب ...... اقامتِ دین اور حکم بالعدل کا فریضہ ادا کرنا ترک کر دیں گے تو پھر حکومت ان کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ جب خود حدیث میں توقیت و تحدید کر دی گئی ہے تو قریش کی حکومت کو کلیہ اور ابدی حکم کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن عورت کی حکمرانی سے متعلق حدیث میں نہ تو کسی توقیت و تحدید کا ذکر آیا ہے اور نہ کوئی شرط لگائی گئی ہے اس لیے یہ شریعت کا ابدی حکم ہے اور قاعدہ کلیہ ہے۔

۶۔ مسلمان شہزادیوں کی حکمرانی کو سندِ جواز بنانا

عورت کی حکمرانی کے جواز اور حدیثِ رسولؐ کے ایرانی ملکہ کے ساتھ مختص ہونے پر رضیہ سلطانہ، چاند بی بی اور بھوپال کی شہزادیوں کی حکومتوں کو بھی بطور دلیل پیش کیا جا رہا ہے۔

جواب

حیرت ہے کہ بے نظیر کے دلدادہ کچھ لوگ ان درباری امرا اور فوجی افسروں کے طرزِ عمل کو تو نمونۂ عمل بناتے ہیں۔ جنہوں نے رضیہ سلطانہ، چاند بی بی اور بھوپال کی شہزادیوں کو تخت پر بٹھایا تھا۔ لیکن سنّتِ رسولؐ، سنّتِ خلفائے راشدین اور اموی وعباسی اُمراء کے طرزِ عمل کو ملحوظ نہیں رکھتے جنہوں نے صحابیاتؓ اور تابعیاتؒ اور تبع تابعیاتؒ میں سے کبھی نہ کسی کو جانشین بنایا تھا اور نہ حکمرانی کے تخت پر بٹھایا تھا۔ چودہ صد سالہ تاریخِ اسلام کی غالب ترین اکثریت کے تعامل کو چھوڑ کر چند گنی چنی خواتین کو دلیل بنانا تحقیق نہیں

ہے بلکہ نص صریح ضروری ہے۔ اگر بادشاہوں، نوابوں اور شہزادیوں کے عمل کو دلیل بنایا جا سکتا ہے تو پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ موروثی بادشاہت بھی اسلام میں جائز ہے، بلکہ یہ بھی کہنا پڑے گا کہ حکومت تلوار کے زور سے اور شاہی امراء کی محلاتی سازشوں کے ذریعے حاصل کرنا بھی جائز ہے۔ اس لیے کہ مسلمان بادشاہتوں میں تو یہ سب کچھ ہوتا رہا ہے ___ رضیہ سلطانہ، چاند بی بی اور بیگماتِ بھوپال یا دوسری مسلم خواتین کی حکومتوں کے جواز کا فتویٰ اس دور کے علماء میں سے کسی نے بھی نہیں دیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حالات کے دباؤ کی بنا پر کچھ علماء خاموش ہو گئے تھے۔ اسی طرح نواب صدیق الحسن خان نے بھی جواز کا فتویٰ نہیں دیا تھا۔ بیگماتِ بھوپال کی حکمرانی پر ان کی خاموشی کسی مصلحت پر مبنی ہوگی۔ مگر رسول اللہؐ کے علاوہ کسی عالم کی خاموشی شرعی دلیل نہیں بن سکتی، بلکہ دلیل شرعی کے بغیر کسی مفتی کا فتویٰ بھی حجت نہیں ہے جب کہ ان خواتین کی حکومتوں کے شرعاً جائز ہونے کا فتویٰ بھی کسی نے نہیں دیا تھا۔

۷۔ صدارت کے لیے محترمہ فاطمہ جناح کی نامزدگی کو سندِ جواز بنانا

ایوب خانی آمریت سے نجات حاصل کرنے کے لیے محترمہ فاطمہ جناح کو صدارتی انتخاب میں امیدوار نامزد کیا گیا تھا۔ اور مولانا مودودیؒ اور مفتی محمد شفیعؒ نے اس کی حمایت کی تھی۔ اس نامزدگی اور حمایت کو بھی آج بے نظیر اور اس کے حمایتی بڑے زور شور سے اچھال رہے ہیں۔

جواب

مولانا مودودیؒ اور مفتی محمد شفیعؒ کی رائے ہم نے گذشتہ سطور میں نقل کر دی ہے کہ عورت حکمران نہیں بن سکتی۔ مفتی صاحب مرحوم نے تو اس پر اجماع نقل کیا ہے اور مولانا مودودیؒ کے نزدیک پارلیمنٹ کی رکنیت اور مختلف محکموں کی سربراہی کے لیے بھی عورت کا انتخاب درست نہیں ہے۔ اس واضح اور غیر مبہم وضاحت کے باوجود ان کو عورت کی سربراہی کی تائید کرنے والوں میں شمار کرنا دھوکہ دہی اور سیاست بازی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ باقی رہی محترمہ فاطمہ کی نامزدگی کی حمایت تو اس کی وجہ یہ تھی کہ محترمہ کو دراصل

مستقل طور پر صدارت اور حکمرانی کے لیے نامزد نہیں کیا گیا تھا بلکہ آمریت کے خلاف تحریک کی قیادت کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ منتخب ہو جانے کی صورت میں تین ماہ کے اندر پارلیمانی نظام کے لیے نئے انتخابات کرائے جائیں گے اور نیا مرد حکمران منتخب کیا جائے گا۔ لیکن پیپلز پارٹی نے جو انتخابات کے بعد بے نظیر کو پانچ سال کے لیے وزیراعظم مقرر کروایا ہے تو اس وقت وہ کون سی آمریت ہے جسے ختم کرانے کے لیے اُسے یہ تکلیف دی گئی ہے جب کہ اس کی گود میں ایک نومولود بچہ بھی ہے۔ جس کو یہ آمر سمجھتی تھی اُس نے تو شہادت کی سعادت حاصل کر لی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ملک کی سالمیت کو خطرہ ہے اور سندھ میں علیحدگی پسندوں کی سازشیں ہو رہی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ علاقائی تعصبات اور لسانی و نسلی قومیتوں سے نجات کا ذریعہ بے نظیر نہیں ہے، بلکہ عدل و انصاف کا قیام اور اسلامی نظام ہے۔ پیپلز پارٹی کی قیادت نے تو ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد ملک کو توڑنے کا کردار ادا کیا تھا۔ آج اسے کس بنا پر ملک کی سالمیت کا نشان سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ تو توڑنے کا نشان ہے جوڑنے کا نشان نہیں ہے۔

۸ ۔ سانحۂ جمل میں حضرت عائشہؓ کی شرکت کو سندِ جواز بنانا

جنگ جمل میں ام المومنین حضرت عائشہؓ کی شرکت اور قیادت کو بھی کچھ لوگ عورت کی حکمرانی کے لیے سندِ جواز بناتے ہیں۔

جواب

سانحۂ جمل میں حضرت عائشہؓ کی شرکت نہ حکومت کی سربراہی تھی اور نہ حکومت کے حصول کی کوشش تھی، بلکہ خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے اور مسلمانوں کے درمیان مصالحت کی ایک کوشش تھی اور یہ کسی نے بھی نہیں کہا کہ عورتیں مظلوم کی حمایت اور مصالحت کی مہم میں بھی حصہ نہیں لے سکتیں۔ یہ ایک خلطِ مبحث اور مغالطہ انگیزی ہے جسے بے نظیر کے یہ پیرو اپنے دلیل بنا رہے ہیں۔ ام المومنینؓ نے مکہ مکرمہ سے بصرہ جاتے وقت یہ اعلان کروایا تھا:

"ہم خونِ عثمانؓ کا بدلہ دلوانا چاہتے ہیں"۔[1]

بصرہ کے قریب پہنچ کر ام المومنینؓ نے بصرہ کے سربرآوردہ لوگوں کے نام جو خط لکھا تھا، اُس میں اپنا مقصد یہ بیان کیا تھا:

"میں اس لیے مسلمانوں کے ساتھ نکلی ہوں کہ ان کو باغیوں کے ظلم سے باخبر کردوں اور مسلمانوں کو وہ تدبیر بتلا دوں جو ان کے لیے مناسب ہے اور وہ ہے اصلاح کرانا"۔[2]

بصرہ پہنچنے پر لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت عائشہؓ نے فرمایا:

"تمہارے لیے مناسب بات یہی ہے کہ عثمانؓ کے قاتلوں کو گرفتار کرلو اور ان پر اللہ کی کتاب کا فیصلہ (قصاص) نافذ کردو"۔[3]

حضرت علیؓ نے جب حضرت قعقاعؓ بن عمرو کو اپنا ایلچی بنا کر حضرت عائشہؓ کے پاس بھیجا تو اس کے سوال کے جواب میں ام المومنینؓ نے فرمایا: "اے میرے بیٹے میں اصلاح کے لیے یہاں آئی ہوں"۔ چنانچہ صُلح کے مذاکرات شروع ہو گئے اور مکمل بھی ہو گئے۔ لیکن دونوں جانب قاتلینِ عثمانؓ کے سبائی گروہ کے ایجنٹ گھُسے ہوئے تھے انہوں نے رات کو خفیہ طور پر جنگ شروع کر کے دونوں فریقوں کو ایک دوسرے سے بدظن کر دیا۔ اور پھر وہی ہوا جو مقدر تھا۔[4]

تاریخ اور حدیث کی کسی روایت میں یہ نہیں آیا کہ حضرت عائشہؓ کو حضرت علیؓ کے مقابلے میں خلافت کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔ حضرت علیؓ کی خلافت تو سب تسلیم کرتے تھے یہ ساری مہم قاتلینِ عثمانؓ سے بدلہ دلوانے اور مسلمانوں کے درمیان مصالحت کے لیے

---

[1] الکامل از ابن اثیر جلد ۳ ص ۲۰۶
[2] " " " ص ۲۱۰
[3] " " " ص ۲۱۳
[4] " " " ص ۲۲۴ اور ص ۲۳۲ تا ۲۴۲

شروع کی گئی تھی۔

حضرت عائشہؓ اپنے اس اقدام پہ پشیمان اور پریشان تھیں

اگرچہ ام المومنینؓ کا یہ اقدام جاہ طلبی اور حکومت کے حصول کے لیے نہیں تھا، بلکہ اخلاص نیت کے ساتھ ایک نیک کام کے لیے تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے اس عمل پہ بعد میں نادم بھی تھیں اور پریشان بھی تھیں۔

ابن سعدؒ متوفی ۲۳۰ھ لکھتے ہیں کہ:

"حضرت عائشہؓ جب یہ آیت پڑھتیں کہ " وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ " تو رونی تھیں۔ یہاں تک کہ آنسوؤں سے اپنے دوپٹے کو تر کر دیتی تھیں"[1]

ابن ابی شیبہؒ متوفی ۲۳۵ھ نے حضرت عائشہؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

" کاش میرے دس بیٹے مرجاتے (اگر ہوتے) مگر ابن زبیرؓ کے ہمراہ یہ سفر نہ کرتی " (بصرے کا سفر)[2]

ام المومنینؓ کے اس اقدام سے دوسرے جن صحابہؓ وصحابیاتؓ نے اختلاف رائے کیا تھا، ان کا ذکر اس لیے ضروری نہیں ہے کہ خود انہوں نے بعد میں اپنے اس اقدام کو نامناسب سمجھ لیا تھا اور اس کو یاد کر کے پریشان ہو جاتی تھیں۔

۹۔ جہاد میں صحابیاتؓ کی شرکت کو سندِ جواز بنانا

"دورِ نبوی میں بعض اوقات) صحابیاتؓ غزوات میں شریک ہوتی تھیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ شہیدوں کی لاشیں اٹھاتی تھیں اور مجاہدین کو پانی پلایا کرتی تھیں"[3]

---

[1] طبقات ابن سعد طبع بیروت جلد ۸ ص ۸۱

[2] المصنف از ابن ابی شیبہ جلد ۱۵ ص ۲۷۷

[3] صحیح البخاری ۔ کتاب الجہاد جلد ۱ ص ۴۰۳

جہاد میں خواتین کی اس شرکت کو بھی بعض لوگ عورت کی حکمرانی کی دلیل سمجھ بیٹھے ہیں۔

جواب

ناطقہ سر بگریباں ہے کہ آخر اس استدلال کو کونسا نام دیا جائے؟ ایک موٹی سی عقل والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ حالتِ جنگ (ایمرجنسی میں) جنگی خدمات اور چیز ہے اور پورے ملک کی سربراہی ایک اور چیز ہے۔ جنگی خدمات کو بوقت ضرورت اور بقدرِ ضرورت حدیث میں جائز قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ نفیرِ عام کے وقت عورتوں پر لڑنا بھی فرض ہو جاتا ہے اور اس کے لیے شوہر سے اجازت لینا بھی ضروری نہیں ہوتا۔ لیکن ریاست کی سربراہی اور حکمرانی کی ذمہ داری سے جب اللہ و رسولؐ نے عورتوں کو سبکدوش کر دیا ہے۔ اور یہ ذمہ داری مردوں پر ڈال دی گئی ہے تو اس کو غزوات میں شریک یا دوسری سوشل سرگرمیوں پر قیاس کر کے کیسے جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟

۱۰۔ اِنَّ النِّسَاءَ شَقَائِقُ الرِّجَالِ کو سندِ جواز بنانا

ترمذی، ابوداؤد اور مسندِ احمد میں آیا ہے کہ اُمِّ سُلیمؓ نے رسول اللہؐ سے پوچھا "کیا عورتوں پر بھی غسلِ جنابت واجب ہو جاتا ہے جب کہ وہ اِحتلام کی وجہ سے اپنے کپڑوں یا جسم پر تری دیکھ لیں"۔ تو آپؐ نے فرمایا: "نَعَمْ اِنَّ النِّسَاءَ شَقَائِقُ الرِّجَالِ" "ہاں! عورتیں مردوں کی مانند ہیں"۔ اس حدیث کو بھی بعض لوگ عورت کی حکمرانی کی دلیل سمجھ رہے ہیں کہ جب عورتیں مردوں کی مانند ہیں تو حکومت کا فرض ادا کرنے میں بھی دونوں مساوی ہیں۔

جواب

اِس حدیث کا سیاق و سباق حکمرانی کے بارے میں نہیں ہے بلکہ احتلام اور غسلِ جنابت سے متعلق ہے۔ اور حدیث کا صاف اور واضح مفہوم یہ ہے کہ احتلام اور منی خارج ہونے میں اور اس کی وجہ سے غسل واجب ہونے میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔ یعنی مرد اور عورت دونوں کی طبیعت اور سرشت میں پیدائشی طور پر مادہ مولِّدہ

یعنی منی موجود ہے۔ اور فطری طور پر یہ منی خارج بھی دونوں سے ہوتی ہے۔ لہٰذا احتلام کی بنا پر غسل بھی دونوں پر واجب ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مرد اور عورت اور بھی بہت سی چیزوں اور بہت سے احکام میں برابر ہیں۔ یہ تو کسی نے بھی نہیں کہا کہ عورت اور مرد کے درمیان کسی چیز میں بھی اشتراک اور برابری نہیں ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ بھی تو نہیں ہیں کہ عورت ہر چیز میں مرد کے مانند ہے۔ حیض و نفاس عورتوں پر آتا ہے مگر مردوں پر نہیں آتا۔ عورتوں سے بچوں کی ولادت ہوتی ہے مگر مردوں سے نہیں ہوتی۔ اس حدیث کا یہ مفہوم لینا کہ عورتیں ہر معاملے میں اور ہر کام میں مردوں کے مانند ہیں، حقائق کے بھی خلاف ہے اور قرآن و سنت کی دوسری اُن نصوص کے بھی خلاف ہے۔ جن میں بعض اُمور میں دونوں کے درمیان فرق رکھا گیا ہے۔ مثلاً میراث، شہادت اور حکمرانی وغیرہ۔ آیات و احادیث کی تشریح کرتے وقت دوسری آیات و احادیث کو بھی مدّنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اور یہی تحقیق کا صحیح طریقہ ہے۔ محدثینؒ اور فقہاء نے درج بالا احادیث کا یہی مفہوم بیان کیا ہے اور چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ میں کسی نے بھی اس کو عورت کی حکمرانی کے لیے سندِ جواز نہیں بنایا، بلکہ سب نے عورت کی حکمرانی کو شرعاً ناجائز قرار دیا ہے۔ اگر اس سے عورت کی حکمرانی کا جواز ثابت ہو سکتا تو چودہ سو سال میں کوئی نہ کوئی محدث اور فقیہ تو اس کا ذکر بطور دلیل کر لیتا، لیکن کسی نے بھی نہیں کیا۔

۱۱۔ اسمبلیوں کی رُکنیت کو سندِ جواز بنانا

کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ جب خواتین اسمبلیوں کی ارکان بن سکتی ہیں تو وہ حکومت کی سربراہ بھی بن سکتی ہیں۔ اس لیے کہ سربراہِ حکومت ارکانِ اسمبلی ہی میں سے منتخب کیا جاتا ہے۔

جواب

مولانا مودودیؒ اور بعض دوسرے علماء کے نزدیک تو خواتین اسمبلیوں کی رُکن نہیں بن سکتیں، البتہ اُن کی الگ مجلسِ شوریٰ بنائی جا سکتی ہے، مگر مجھے اس کے عدم جواز پہ

کوئی مضبوط اور واضح دلیل نہیں مل سکی۔ موجودہ اسمبلیوں کے تو مرد ارکان بھی اہلیت کے شرعی معیار پر پورے نہیں اترتے اور خواتین کی حالت تو اور بھی ناگفتہ بہ ہے لیکن اصولی طور پر اگر قومی یا صوبائی نمائندگی کی اہلیت کی شرائط موجود ہوں تو صرف عورت ہونے کی وجہ سے اسے ان اداروں کی رکنیت سے محروم کرنا مناسب نہیں ہے۔ اسمبلیاں (مجالسِ شوریٰ) قانون ساز ادارے بھی ہیں اور انتخابی ادارے بھی ہیں اس لیے کہ وزیراعظم صدرِ مملکت اور وزراءِ اعلیٰ کا انتخاب یہ اسمبلیاں کرتی ہیں۔ قانون سازی ایک علمی اور تحقیقی کام ہے اور انتخاب کا تعلق بھی رائے دہی سے ہے اور عورتیں علمی تحقیق اور رائے دہی سے محروم نہیں کی گئیں۔ عورتوں کے ناقص العقل ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان کی رائے اور تحقیق ہمیشہ غلط ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم اور احادیثِ صحیحہ سے عورتوں سے مشورہ لینا اور اگر صحیح ہو تو اس پر عمل کرنے کا جواز ثابت ہے۔ دَورِ نبوی اور دَورِ خلافتِ راشدہ میں صحابیاتؓ اور تابعیاتؒ فتویٰ دیتی تھیں اور دوسرے علمی کام کرتی تھیں۔ مُستشار کے لیے مرد ہونے کی شرط کسی نقلی اور عقلی دلیل سے ثابت نہیں ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ مردوں اور عورتوں کا اختلاط ممنوع ہے تو اختلاط اس وقت ممنوع ہے کہ پردے کی پابندی نہ کی جائے اور نشستیں مخلوط ہوں۔ مگر جب خواتین ارکان کی نشستیں مرد ارکان کے پیچھے ہوں، الگ ہوں اور وہ باپردہ بھی ہوں تو شرعاً اس کی ممانعت نہیں ہے۔ دَورِ نبوی میں عورتیں مسجد میں آکر مردوں کے ساتھ نماز پڑھتی تھیں لیکن ان کی صفیں مردوں کی صفوں سے پیچھے ہوتی تھیں۔ اسی طرح نمازِ عید کے لیے عورتیں بھی عیدگاہ میں آیا کرتی تھیں لیکن مردوں سے الگ اور پیچھے بیٹھا کرتی تھیں۔ مطاف کعبہ میں مرد اور عورتیں دونوں ایک ہی وقت میں طواف کرتے تھے مگر حکم یہ تھا کہ عورتیں مردوں کے پیچھے رہ کر طواف کریں۔ یہ صورت اختلاط کی نہیں ہے بلکہ عدمِ اختلاط کی ہے۔ اس موضوع پہ مزید تفصیل میری کتاب اسلامی سیاست میں موجود ہے۔

مگر حکومت کی سربراہی کو اسمبلیوں کی رکنیت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے ایک تو اس وجہ سے کہ عورت کی سربراہی کے ممنوع ہونے کے لیے قرآن و سنت میں دلائل موجود ہیں

(باقی برصفحہ ۵۶)

قومیت اور وطنیت کی تحریک کا فروغ

اور

اس کا اسلامی حل

جناب پروفیسر سید محمد سلیم صاحب

معاشرہ کی شیرازہ بندی انسان طبعاً اجتماعیت پسند ہے۔ وہ تنہا اور منفرد زندگی نہیں گزار سکتا، وہ خاندان، کنبے اور قبیلے میں رہتا ہے۔ انسان ایک معاشرہ کے اندر زندگی بسر کرتا ہے جب تک انسانی معاشرہ جدا جدا قبیلوں تک محدود رہا اُس وقت تک خونی رشتے اور قبائلی وابستگی کو اہمیت حاصل رہی۔ جب انسانی معاشرہ نے وسعت اختیار کر لی اور معاشرہ ایک سے زائد قبیلوں پر مشتمل ہونے لگا تو وابستگی کے لیے نئی بنیاد تلاش کرنا پڑی جو مختلف قبائل کو باہم جوڑ سکے اور باہم مربوط رکھ سکے۔

انسانی زندگی کے آغاز میں ہی اللہ تعالیٰ کے فرستادہ نبیوں نے آکر انسانوں کو ایمان باللہ کی تعلیم دی تھی اور بتایا تھا کہ یہی وہ کلمہ جامعہ ہے جو تمام انسانوں کو ایک رشتہ میں منسلک رکھ سکتا ہے۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد ہی انسانی فکر میں گمراہی آگئی۔ انہوں نے اللہ کے بجائے بتوں کی پرستش شروع کر دی۔ بت پرستی کی ہی ایک شکل بادشاہ پرستی تھی طاقتور حکمرانوں نے اپنی رعایا کو مجبور کیا کہ وہ بتوں کے طور پر بادشاہوں کی پوجا کریں، پرستش کریں۔ اس طرح ان کا اقتدار اور زیادہ مستحکم ہو گیا۔

قطع نظر اس بات سے کہ شاہ پرستی بذات خود کس قدر غلط ہے، غیر حقیقی ہے اور قابلِ مذمت ہے، مگر اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس قدیم دور میں بھی

اجتماعی شیرازہ بندی کے لیے مادی رشتے کے بجائے غیر مادی رشتے، مذہبی رشتے کو استعمال کیا گیا۔ قدیم بادشاہتیں، مذہب کے رشتے پر قائم تھیں۔ مذہب خواہ کیسا بچگانہ ہو، ناپختہ ہو، وہ بہرکیف انسان کو حیوانیت سے بلند اور اشرف مخلوق قرار دیتا ہے۔ وہ انسانوں کی زندگی میں اخلاقی اور روحانی افدار کو فروغ دینا چاہتا ہے۔ مشرق و مغرب ہر جگہ مذہب کے غلبے کے معنی یہ تھے کہ دینی اور اخلاقی افدار کا چلن عام ہو۔ انسان زندگی کنبے اور قبیلے میں گذارے مگر اس کا مطمحِ نظر بلند ہو۔ اس کے تصورِ انسان میں ساری انسانیت داخل ہو۔ مذہبی نقطۂ نظر قبول کر لینے کے بعد انسانوں میں پائے جانے والے غیر ضروری اختلافات ــ شکل وصورت، زبان و رنگ، نسل و خاندان، رسوم و روایات ــــ کو اہم نہیں سمجھا جاتا۔ اصل اہمیت دینی اور اخلاقی افدار کی ہوتی ہے۔ اس لیے ان اختلافات کے حامل افراد ایک معاشرہ میں، ایک مملکت کے اندر، ایک حکمرانی کے تحت امن و امان کی زندگی بسر کرتے تھے۔ مذہبی نقطۂ نظر قبول کر لینے کے بعد حکمرانوں کی سوچ میں بھی تبدیلی آجاتی تھی۔ حکمران خود کو زمین پر "خدا کا سایہ" سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کے نقطۂ نظر میں رعایا کے لیے رحمت و شفقت ہوتی تھی۔ حتی الوسع وہ عدل و انصاف کے ساتھ حکمرانی کرتے تھے۔ افراد، گروہ اور قبائل کے درمیان طبعی اور فطری اختلافات کی بنا پر باہمی منافرت کے جذبہ کو بھڑکنے نہیں دیا جاتا تھا۔ غیر اہم اختلافات کی بنا پر جنگ و جدال کو ناپسندیدہ قرار دیا جاتا تھا۔

دنیا میں تمام قوموں کا حال یکساں نہیں ہے۔ سامی اور تورانی نسلوں کی تاریخ میں مذہب اور نسل کے نام پر جنگوں کا سلسلہ بہت کم ہے، البتہ آریائی قوموں میں نسلی برتری اور نسلی تفاخر کا جذبہ بہت گہرا ہے، اس لیے ان کے یہاں طویل طویل جنگوں کا پتہ چلتا ہے۔ شاعری میں طویل طویل جنگ نامے آریائی قوموں نے تصنیف کیے ہیں۔ الیڈ اور اوڈیسی یونان کے آریایوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں اور رامائن اور مہابھارت ہندوستان کے آریاؤں کی لکھی ہوئی کتابیں۔ ہندو آریاؤں نے ہندوستان کے قدیم باشندوں دراوڑوں کو محکوم بنایا۔ ان کو اچھوت قرار دیا۔ انسانی بنیادی حقوق سے ان کو محروم قرار دیا۔

گذشتہ پانچ ہزار سال سے وہ بنیادی انسانی حقوق سے محروم چلے آرہے ہیں۔ کسی نے محکوم قوم سے اتنا سخت انتقام نہیں لیا۔ ہندوؤں نے بدھ مت، مذہبی اقلیت کو جب تک اپنی سرزمین سے دلیس نکالا نہیں دے دیا اُس وقت تک وہ چین سے نہیں بیٹھے۔ جدید دور میں مسلمان اقلیت سے ان کا سلوک کھلم کھلا نسل کشی کے مترادف ہے۔ دوسری مذہبی اقلیت سکھ اُن کے رویہ سے نالاں ہے۔ سکھوں کے مذہبی مقامات کا تقدس بھی محفوظ نہیں رہا۔

یورپ کی آریا اقوام نے قرونِ وسطیٰ میں قتل وغارت گری اور کشت وخون کا بازار گرم رکھا۔ مختلف مذہبی فرقوں کے درمیان بڑے پیمانہ پر خونریزی ہوئی۔ فرانس میں سینٹ بارتھولومیو کے مقدس دن پر کیتھولک فرقے کے لوگوں نے ہیوجونٹ پروٹسٹنٹ فرقے کے لوگوں کا قتلِ عام کیا۔ ایک دن میں اسی ہزار افراد کو بے دردی سے قتل کر ڈالا۔ سفاکی اور ہلاکت آفرینی کے مناظر سے انسانی ضمیر چیخ اُٹھا۔ ہر طرف سے فرقہ پرستی کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہونا شروع ہوگئیں۔ اِس ذہنی پس منظر میں یورپ کے حکما اور مفکرین نے اس مسئلہ کا حل یہ نکالا۔

— مذہب کو انسانی زندگی کے معاملات سے کلیتہً بے دخل کر دیا جائے۔

— معاشرہ کی شیرازہ بندی مذہب کی بجائے حُبِّ قوم اور حُب وطن کے فطری جذبے پر رکھی جائے۔

اس نظریہ کو لادینیت (SECULARISM) کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد سے یورپ میں لادینیت کا مسلک عام ہوگیا۔ اور مقبول ہوگیا۔ لادینیت کے مسلک کا غلبہ ہو جانے کے بعد اہلِ یورپ کے سامنے معاشرہ کی شیرازہ بندی کے لیے کوئی اُصول باقی نہیں رہا۔ اجتماعی زندگی میں خلا واقع ہوگیا۔ انہوں نے حُب وطن کے طبعی جذبے کو اور حُب قوم کی جبلت کو خلا پُر کرنے کے لیے استعمال کیا۔ بتدریج اہلِ یورپ کا خدا پر ایمان ختم ہوتا گیا۔ خالی جگہ پر وطنیت کے دیوتا نے قبضہ جما لیا۔

یہی وہ دور ہے جب یورپ کی اقوام دُنیا جہان کی تسخیر پر متوجہ تھیں۔ امریکہ، افریقہ،

اور ایشیا کے وسیع و عریض خطوں پر ان قوموں نے قبضہ جما لیا تھا۔ وہاں کی دولت سے اپنا گھر بھر لیا، اس عالمی لوٹ کھسوٹ سے تقریباً سارا ہی یورپ مستفید ہو رہا تھا۔ ملک کے اندر تمام افراد فیض یاب ہو رہے تھے۔ دولت کی بارش ہو رہی تھی۔ اس لیے اہل یورپ چین کی بنسری بجا رہے تھے۔ اس کی وجہ سے یورپی اقوام میں باہمی جنگ وجدال میں بھی کمی واقع ہوئی۔ اس کی تعبیر یہ کی گئی کہ اجتماعی زندگی سے مذہب کو بے دخل کر دینے اور وطنی قومیت قبول کر لینے سے یہ امن چین اور یہ خوشحالی ملی ہے۔ حالانکہ حقیقت صرف اس قدر ہے کہ اس دور میں ان ممالک کی تمام تر توجہ ایشیا اور افریقہ کے ممالک کی لوٹ کھسوٹ پر مرکوز تھی۔ دوسرے تمام مسائل نظر انداز تھے۔ بہرکیف اس دور میں قوم پرستی اور وطنیت کی تحریک کو خوب فروغ اور استحکام حاصل ہوا۔

وطنیت کی حقیقت وطنی قومیت کا تصور یورپ سے آیا ہے۔ اس کا مفہوم متعین کرتے کے لیے اہل یورپ کی تحقیقات سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔ یورپ کی زبانوں میں قومیت کے لیے لفظ (NATION) ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں نیشن کا لفظ گروہ کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ جس طرح ہمارے یہاں لفظ "قوم" گروہ کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ مثلاً قدیم تحریرات میں ملتا ہے کہ پریگ کی جامعہ میں چار قوموں کے طلبہ پڑھتے تھے۔ بویریا، بوہیمیا، پول اور لیکسن۔ حالانکہ یہ سب ایک ہی ملک جرمنی کے حصے تھے۔ اٹھارھویں صدی کا انگریزی ادیب سیموئیل جانسن (SAMUAL - JOHNSON - 1709 - 1784) اس لفظ کو گروہ کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ YOU ARE A SUBTLE NATION,- اس میں اطباء کے گروہ کو وہ نیشن کہتا ہے۔ YOU PHYSICIANS

مارٹن لوتھر (MARTIN LUTHER - 1483 - 1546) غالباً پہلا شخص ہے جس نے لفظ نیشن کو معاشرہ کے صاحبِ اقتدار گروہ کے لیے استعمال کیا۔ اور عوام الناس کے لیے اس نے لفظ FOLK استعمال کیا۔ اس کے بعد سے نیشن کے مفہوم میں اقتدار کا عنصر شامل ہو گیا۔ نیشن کے معنی صاحبِ اقتدار گروہ کے ہو گئے۔ یہ مفہوم ترقی کرتا رہا حتیٰ کہ آج کل نیشن ملک کی مقتدر اعلیٰ آبادی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ہر ہر ملک کے

باشندے اقتدارِ اعلیٰ کے حامل قرار پائے۔

قوم کی تعریف بیان کرنا اور اس کا حقیقی مفہوم ادا کرنا ایک مشکل کام ہے۔ مختلف لوگوں نے اس سلسلہ میں جو کوششیں کی ہیں ان کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

پروفیسر کر (CARR) کہتا ہے " قوم کی تعریف کرنا ممکن نہیں ہے "۔

پروفیسر کارل ٹن ہیسی (CARLTON HESSI) کہتا ہے " قوم ایک مبہم لفظ ہے۔ ایک رمز بر (MYSTERIOUS) لفظ ہے۔

لارڈ برائس (LORD BRYCE - 1838 - 1922) لکھتا ہے " قوم سے مراد اشخاص کا ایسا مجموعہ ہے جن کو چند مخصوص جذبات نے ملا کر باہم مربوط کر دیا ہو"۔

دائرہ معارفِ اخلاق اور مذہب کا بیان ہے " قومیت اوصاف کا ایک ایسا مرکب ہے۔ جو ایک گروہ کے افراد میں مشترک ہو۔ جو ان کو جوڑ کر ایک قوم بنا دے "۔

پروفیسر ایمرسن (EMERSON) کہتا ہے۔ " انسانوں کا وہ گروہ جو خود کو ایک قوم سمجھے بس وہ ایک قوم ہے "۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک تعریف ہونے کے بجائے ایک ادعا ہے۔ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صحیح بات اسی تعریف میں پنہاں ہے۔ " قومیت ایک اندرونی شعور ہے، جو مختلف افراد کو ایک رشتہ میں ایک قوم میں مربوط کر دیتا ہے "۔

قومیت اور وطنیت کی بنیاد تلاش کرنے میں بھی اہل علم کے درمیان اختلاف ہے کہ وہ مشترک صفت کیا ہے جس نے افراد کو اور گروہوں کو ایک رشتہ میں منسلک کر دیا ہے۔

ہرڈر (HERDER - 1744 - 1803) نے رسوم و رواجات اور ثقافت کو قومیت کی بنیاد قرار دیا ہے۔

گوبینو (GOBINEAU - 1816 - 1862) نے نسل کو قومیت کی بنیاد قرار دیا ہے۔ وہ نارڈک نسل (NORDIC RACE) کو دنیا کی اشرف ترین نسل مانتا ہے۔

نطشہ (NEITZSCHE - 1844 - 1900) نے زبان پر زور دیا ہے

زبان کو وہ قومیت کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک جرمن زبان دنیا کی اعلیٰ ترین زبان ہے۔

اِس طرح مختلف لوگوں نے مختلف اُمور کو قومیت کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو یہ درج ذیل نو امور بنتے ہیں۔

۱۔ مشترکہ نسل۔

۲۔ مشترکہ زبان۔

۳۔ مشترکہ مذہب۔

۴۔ مشترکہ ثقافت و تہذیب۔

۵۔ مشترکہ مزاج و عادات و اطوار۔

۶۔ مشترکہ تاریخ۔

۷۔ مشترکہ شعور محبت و دوستی۔

۸۔ مشترکہ شعور دشمنی و نفرت۔

۹۔ مشترکہ آرزوئے آزادئ وطن۔

قومیت اور وطنیت کی تحریک سے وقت کی بادشاہتوں اور شہنشاہتوں کو بڑا خوف لاحق ہوا۔ انہوں نے اس جذبہ کو کچلنے کی کوشش کی۔ اِس لیے قوم پرستی کی تحریک کو پروان چڑھنے اور فروغ پانے میں عظیم الشان قربانیاں دینا پڑی ہیں۔ مختلف ملکوں میں مختلف رہنماؤں نے اس کی خاطر سخت جان فشانی اور سخت جدوجہد کی ہے۔ جرمنی میں ہیگل (HEGEL -1770-1831) فِکِٹے (FICHTE -1762-1814) اور ٹریشکے (TRIETSCHKE -1834-1896) نے وطنی قومیت کو مقبولِ عام بنایا۔ فرانس میں گوبینو (GOBINEAU - 1816-1862) نے اور دوسرے لوگوں نے وطنی قومیت کو مقبول بنایا۔ اطالیہ میں مازنی (MAZZINI - 1805 - 1875) اور گیری بالڈی (GARIBALDI - 1807 - 1872) نے وطنی قومیت کے تصور کو مقبولِ عام بنایا۔ مازنی نے تو اس قدر مبالغہ سے کام لیا کہ قوم کو الوہیت (DIVINITY)

کا مظہر قرار دیا۔ اور برملا قوم کو اس نئے دیوتا کی پرستش کی دعوت دی۔ اسی طرح دوسرے ملکوں میں بھی مختلف رہنماؤں نے جدوجہد کر کے وطنی قومیت کو مقبولِ عام بنایا۔

قوم پرستوں کی ان کوششوں سے یورپ میں ایک ہمہ گیر تحریک قومیت برپا ہو گئی۔ جس کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہا۔ مجبوراً سیاست دانوں کو بھی اس کا نوٹس لینا پڑا۔ زوالِ نپولین (۱۸۱۵ء) کے بعد یورپ کی تشکیلِ جدید کے لیے جب وائنا (WIENNA) کی کانگریس میں تمام بڑے بڑے سیاست دان جمع ہوئے تو انہوں نے غور و خوض کر کے قوم کی تعریف متعین کی۔ وہ یہ ہے:

"ہر وہ آبادی جو نسل، تہذیب، مذہب، زبان اور تاریخ کے اعتبارات سے ایک ہو، وہ ایک قوم ہے۔ اور ہر قوم کو سیاسی اعتبار سے آزاد اور خود مختار رہنے کا حق حاصل ہے۔"

وائنا کی کانگریس قوم پرستی کی تحریک میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے یہاں سے یورپ کی سیاست میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ تاریخ نے ایک نیا ورق الٹ دیا۔ اس کے بعد سے سیاست کاری میں جذبۂ محرکہ اور فعال عامل صرف قوم پرستی کا جذبہ بن گیا۔ اس کے بعد ہر ملک نے کوشش کی کہ وہ خود کو ایک قوم ثابت کر دے۔ زبان، نسل اور وطن سے متعلق انفرادیت کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کیا گیا اور ان کی خوب خوب ترویج و اشاعت کی گئی۔ قومی عظمت کے بیان کے لیے تاریخ کو استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد تاریخ واقعات کا بے لاگ بیان ہونے کے بجائے قومی عظمت کا ایک مدلل مقدمہ معلوم ہوتی ہے۔ اس دور میں آثارِ قدیمہ (ARCHAEOLOGY) نے غیر معمولی اہمیت اختیار کر لی۔ اب قومی عظمت کے لیے نسلی تفاخر، لسانی برتری اور تاریخی عظمت جیسے امور کا بیان کرنا ضروری ہو گیا۔

(باقی)

نبی اکرم ﷺ کی کفالت کس نے کی؟

جناب ابوطالب نے یا جناب زبیر بن عبدالمطلب نے

جناب پروفیسر ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی

عام قارئین کو مضمون کا یہ عنوان عجیب معلوم ہوگا، بلکہ اچھے خاصے تعلیم یافتہ اور بیشتر علماء و اہل دین کو اس سوال پر پریشان کن حیرت ہوگی، کیونکہ سیرتِ نبوی کی قدیم و جدید تمام کتابوں میں خواہ وہ عربی میں ہوں یا دوسری زبانوں (اردو، فارسی، انگریزی، فرنچ وغیرہ) میں یہی لکھا ہے کہ سرورِ کائنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش آنحضرت کے دادا عبدالمطلب کی وفات کے بعد آپ کے چچا ابوطالب کے زیرِ سایہ ہوئی اور اگرچہ وہ اسلام نہیں لائے لیکن بعثت نبوی کے بعد سے کفارِ قریش کے مقابلہ میں آنحضرت کی نصرت و تائید کا شرف ابوطالب کو ہی حاصل ہوا۔ انتہائی نامساعد حالات میں انہوں نے آنحضرت کا ساتھ دیا۔ تفاصیل عام کتبِ سیرت میں مذکور ہیں۔ جب تک جناب ابوطالب زندہ رہے، کفارِ مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کا ناپاک منصوبہ نہیں بنا سکے۔

اور یہی سب کچھ مسلمان ہر سال سیرتِ نبوی کے جلسوں اور اجتماعات میں علماء و مؤرخین سے سنتے رہے ہیں۔ اور یہی برصغیر کے مشہور ترین محقق سیرت نگار شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی اور قاضی سلیمان منصور پوری مصنف رحمۃ للعالمین نے اور اس صدی کے مشہور ترین عرب سیرت نگار محمد حسین ہیکل مرحوم نے تحریر کیا ہے۔

مگر افسوس کہ اس سب کے برخلاف ہمارے ملک کے ایک صاحب جناب ضیاء الدین کرمانی نے اپنی کتاب " ابدی پیام کے آخری پیغامبر" میں (جو ان کی انگریزی کتاب :

THE LAST MESSANGER WITH A LASTING MISSAGE

کا ترجمہ ہے) یہ انوکھا انکشاف کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش ان کے مشہور چچا ابو طالب نے نہیں بلکہ ایک دوسرے چچا زبیر بن عبدالمطلب کے زیر سایہ ہوئی، اور انہیں کی تائید و نصرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھی - ان کی یہی انوکھی رائے اس مضمون کی محرک ہے -

ضیاء الدین کرمانی صاحب علمی دنیا اور تصنیف و تالیف کے میدان میں پہلے سے کوئی جانی پہچانی شخصیت نہیں ہیں - کتاب میں مؤلف کا جو تعارف لکھا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے تقسیمِ ہند سے کافی پہلے عربی میں ایم-اے کیا تھا - پھر چند سال وہیں عربی و اسلامی تاریخ پڑھائی - لیکن ان کی عمر غیر منقسم ہندوستان میں اور پھر پاکستان میں انفرمیشن ڈیپارٹمنٹ میں گذری - حتیٰ کہ وہ پاکستان کی وزارتِ اطلاعات میں ڈپٹی پرنسپل انفرمیشن آفیسر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے - چالیس سال سے زائد عرصہ تک صحافتی اور سرکاری ذمہ داریاں سنبھالے رہے - وہ یقیناً سرکاری حلقوں میں معروف شخصیت ہوں گے لیکن جو کتاب انہوں نے تحریر کی ہے اس کا تعلق صحافت سے نہیں بلکہ تاریخ اور سیرتِ نبوی سے ہے اور ایک تحقیقی کوشش ہے -

کاتب سطور کا تعلق بھی عربی زبان اور اسلامی علوم و تاریخ سے ہے - یونیورسٹی کی بیشتر تعلیم بھی ایک عرب ملک میں ہوئی ہے اور کیمبرج سے ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد تقریباً چوتھائی صدی تک عرب ملکوں کی مختلف یونیورسٹیوں میں عربی زبان اور اسلامی تاریخ و تمدن وغیرہ کے مضامین پڑھاتا رہا ہوں -

جو کچھ میں آگے کہنا چاہتا ہوں اس کے لیے یہ تعارفی سطور لکھنا ضروری تھا

مجھے اس وقت زیرِ نظر کتاب پر تبصرہ یا تنقید کرنا مقصود نہیں ہے: ہاں اتنا کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک (PROVOCOTIVE) (ہیجان انگیز) کتاب ہے،

اور اس میں مصنف نے بڑے دعوے کیے ہیں، بلکہ "انتساب" کے تحت جو مختصر عبارت تحریر ہے وہ خود ایک بہت بڑا دعویٰ ہے، اور جو افسوس کہ تنقید کی کسوٹی پر کھوٹا ثابت ہوتا ہے، اس پر لکھنے کا موقع انشاءاللہ کسی دوسری فرصت میں ملے گا، اس وقت میں صرف اس موضوع پر بحث کروں گا جس کا عنوان میں ذکر کیا گیا ہے، اتنا ضرور کہوں گا کہ کتاب کا نام مذکورہ نام کے بجائے اگر "سیرت نبوی کے بعض پیچیدہ مسائل" ہوتا تو زیادہ مناسب ہوتا، اس لیے کہ کتاب میں پیغامِ رسالت کو تو نمایاں طور پر اُجاگر نہیں کیا ہے، بعض مسائل کو پیچیدہ بنا کر ان پر بحث کی گئی ہے، جن میں بہت سے صحابہ کرام کی ہستیاں بھی ہیں، جس میں مصنف نے قدیم معتزلہ کی طرح بہت غیر محتاط اور بعید از ادب اسلوب بیان اختیار کیا ہے، بلکہ بعض اوقات انتہائی گستاخانہ ہے۔

جناب کرمانی صاحب نے مسئلہ زیر بحث پر اپنی کتاب کے باب پنجم میں صفحات ۵۶، ۵۷، ۵۹، ۶۰، ۶۱ پر "دادِ تحقیق" دی ہے۔ نہ معلوم انہوں نے بیچ میں صفحات ۵۸، ۵۹ پر بحیریٰ (مصنف نے بحیرا لکھا ہے جو غلط ہے) سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کا مسئلہ اُٹھا مختصر بحث کیوں کی ہے؟

کوئی شک نہیں کہ حضرت ابوطالب کی طرح زبیر بن عبدالمطلب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سگے چچا تھے، لیکن مصنف کا یہ کہنا کہ حضرت عبدالمطلب کی آخری عمر میں زبیر نے سارے خاندان کی ذمہ داری سنبھال لی تھی، محض ایک دعویٰ ہے جس کے لیے انہوں نے کوئی بھی مستند کتابی حوالہ پیش نہیں کیا ہے۔ اور پھر یہ تصریح کہ "عبدالمطلب کی وفات کے بعد آنحضرتؐ کی پرورش کی ساری ذمہ داری زبیر ہی کے سر آپڑی"۔ ایک بے بنیاد استنتاج ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے سر سید احمد خاں کی کتاب "خطباتِ احمدیہ" کا ایک حوالہ دیا ہے، جس کا سیرت کے لٹریچر میں کوئی خاص مقام نہیں اور وہ خود کسی قدیم حوالہ کی محتاج ہے۔ لیکن بقول مصنف سرسید بھی اس حقیقت کو نہ پہنچ سکے، جس کا انکشاف آنجناب نے کیا ہے۔ اور زبیر کا مقام جاننے کے باوجود اس کے قائل رہے کہ آنحضرتؐ کی تربیت ابوطالب نے ہی کی۔

اس کے بعد ہی مصنف نے اپنے دعوے کے ثبوت میں قدیم کتب سے جو بعض حوالے پیش کیے ہیں وہ یا تو موضوع سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، یا علمی بددیانتی کی بدترین مثال ہیں۔

وہ عربی کی مشہور تاریخ الیعقوبی کے حوالے سے لکھتے ہیں: "اور عبدالمطلب کی وفات پر ان کی وصیت کے مطابق کعبہ کی تولیت اور دوسرے معاملات ان کے بیٹے زبیر نے سنبھالے (ص ۶۰)۔" واوصی عبدالمطلب الی ابنہ الزبیر بالحکومۃ وامر الکعبۃ" لیکن افسوس کہ انھوں نے یہاں الیعقوبی کی پوری عبارت نقل نہیں کی، جس کا موضوع زیر بحث سے براہ راست تعلق ہے۔ اور جس سے ان کے جھوٹے دعوے کی صاف تردید ہوتی ہے۔ پوری عبارت یوں ہے: "واوصی عبدالمطلب الی ابنہ الزبیر بالحکومۃ وامر الکعبۃ، والی ابی طالب برسول اللہ وسقایۃ زمزم" (یعنی عبدالمطلب نے وصیت کی کہ قبائل میں فیصلہ کرنے اور کعبہ کے معاملات تو زبیر سنبھال لیں گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت اور زمزم سے حجاج کو پانی پلانے کا کام ابوطالب کے ذمہ ہوگا)۔

اب بتایا جائے کہ اس سے زیادہ علمی بددیانتی کیا ہوگی کہ کرمانی صاحب نے اپنی مطلب برآری کے لیے الیعقوبی کی عبارت کا آدھا اور ضروری جملہ ہی حذف کر دیا، اور ایسا ہی کیا کہ کوئی انسان قرآن کریم کی آیت (یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ) کا ذکر کر کے نماز کے قریب نہ جانے کی تلقین کرے اور اس کے تکمیلی جملہ (وَ اَنْتُمْ سُکٰرٰی) کو حذف کر دے۔

اسی طرح البلاذری کی انساب الاشراف کی جو عبارت انھوں نے نقل کی ہے (ص ۶۰-۶۱) وہ بھی ناقص ہے اور علمی دیانت سے بالکل دُور ہے، انھوں نے البلاذری کی عبارت کا ترجمہ یوں پیش کیا ہے:

"اور بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ زبیر کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت و پرورش ابوطالب نے کی۔ یہ غلط ہے، کیونکہ زبیر معاہدہ حلف الفضول کے وقت حیات تھے، اور رسول اللہ کی عمر اس وقت بیس سال

سے زیادہ تھی"۔

کرمانی صاحب نے اصل عبارت کتاب کے آخر میں نوٹس میں دی ہے، لیکن افسوس کہ یہاں بھی انہوں نے " لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ " کے طریقہ پر عمل کرتے ہوئے بعد کا ضروری جملہ حذف کر دیا ہے، جو یہ ہے: " لا اختلاف بین العلماء فی ان شخوص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی الشام مع ابی طالب بعد موت عبد المطلب باقل من خمس سنین " انساب الاشراف، جلد ۱ص ۸۵، جس کا مطلب یہ ہے: (علماء کے مابین اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ رسول اللہ علیہ وسلم کا ابو طالب کے ساتھ سفر شام عبد المطلب کی وفات کے بعد پانچ سال سے کم کے عرصہ میں پیش آیا)۔

البلاذری نے اس بات کی تردید کی ہے کہ "بعض لوگ" جو کہتے تھے کہ آنحضرت کی کفالت زبیر بن عبد المطلب نے کی، کیونکہ زبیر نے جب حلف الفضول میں شرکت کی تو اُس وقت آنحضرت کی عمر بیس سال سے زائد تھی، حالانکہ جب آنحضرت کی عمر گیارہ یا بارہ سال تھی، اس وقت آپ ابو طالب کے ساتھ شام کے سفر پر گئے تھے، تو پھر یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ زبیر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت کی۔

اِس کی وضاحت بہت کھُل کر انساب الاشراف کے اس پیراگراف میں اسی صفحہ پر ہوتی ہے، جس کو کرمانی صاحب نے توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ البلاذری لکھتا ہے:

ولما احتضر عبد المطلب، جمع بنیہ، فاوصاھم برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکان الزبیر بن عبد المطلب وابو طالب اخوی عبد اللہ لامہ وابیہ، وکان الزبیر اسنھما فاقترع الزبیر وابو طالب ایھما یکفل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ فاصابت القرعۃ فاخذہ الیہ ویقال: بل اختارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی الزبیر، وکان الطف عمیہ بہ، ویقال: بل اوصاہ

عبد المطلب بان یکفله بعده"

ترجمہ: جب عبدالمطلب کی جان کنی کا وقت آیا تو انہوں نے اپنے بیٹوں کو جمع کیا اور ان سب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگہداشت کی ہدایت کی۔ زبیر بن عبدالمطلب اور ابوطالب (آنحضرت کے والد) عبداللہ کے سگے بھائی تھے، زبیر ان میں بڑے تھے۔ سو زبیر اور ابوطالب کے درمیان قرعہ اندازی ہوئی کہ ان میں سے کون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت کرے گا۔ قرعہ ابوطالب کے نام نکلا، سو انہوں نے آنحضرت کو لے لیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطالب کو زبیر پر ترجیح دی، کیونکہ وہ دونوں چچاؤں میں آنحضرت کے ساتھ زیادہ مہربانی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خود عبدالمطلب نے یہ وصیت کی کہ وہ (یعنی ابوطالب) ان کے بعد آنحضرت کی کفالت کریں"۔

اسی طرح البلاذری نے تین اقوال نقل کیے ہیں، اور تینوں سے واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت و تربیت ابوطالب کے حصہ میں آئی، اور آخری قول وہ ہے جس کی تائید البلاذری کے معاصر مورخ الیعقوبی کے بیان سے بھی ہوتی ہے، جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اور جس پر تمام قدیم و جدید مورخین سیرت کا اتفاق ہے، خود البلاذری نے قرعہ کی روایت کو ترجیح دی ہے، کیونکہ " یقال" (یعنی کہا جاتا ہے) کا صیغہ کسی مؤلف کی اپنی رائے کا اظہار نہیں ہوتا ہے۔

اس ضمن میں مصنف نے بعد کے دو مؤرخین کی روایتیں زبیر بن عبدالمطلب سے متعلق نقل کی ہیں۔ ان کا نفس موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن ابوطالب کی مفلسی سے متعلق جو روایت انہوں نے لیعقوبی سے نقل کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کے لیے لکھی ہے وہ ناقص اور ریک طرفہ ہے۔ انہوں نے افسوس کہ مورخ الیعقوبی کے ان الفاظ کو چھپایا ہے، جو قدرے تنگ دستی کے باوجود ان کے سوسائٹی میں اعلیٰ مقام کا اشارہ دیتے ہیں یہ مورخ لکھتا ہے: "وکان ابوطالب سیداً شریفاً مطاعاً مهیباً مع املاقه"

(یعنی ابو طالب اپنی تنگ دستی کے باوجود ایک بارعب، پُر وقار، مانے ہوئے شریف سردار تھے۔ (تاریخ الیعقوبی جلد، ص ۱۴)۔

پھر خود کرمانی صاحب نے ہی اعتراف کیا ہے کہ "یہ عجیب عقدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر سیرت نگار زبیر کا حوالہ دینے اور خاص طور پر نام کے ساتھ ان کا ذکر کرنے سے کتراتے ہیں"۔

جناب کرمانی سے عرض ہے کہ یہ کوئی عقدہ نہیں۔ جب آنحضرتؐ کی پرورش اور کفالت میں ان کا کوئی رول ہی نہیں تو سیرت نگار کیوں ان کا ذکر کریں۔ اور پھر کرمانی صاحب کو معلوم نہیں کہ زبیر بن عبدالمطلب ایک ایسے بچے کی تربیت وکفالت کے لیے موزوں آدمی نہ تھے جس کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے اعلیٰ منصب کے لیے اختیار کیا تھا۔ اس کی تصدیق علامہ آلوسی عراقی کی اس تصریح سے ہوتی ہے، جو انھوں نے زبیر بن عبدالمطلب کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب، الجزء الثالث کے صفحہ ۱۴ پر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: " وکان شاعرا مفلقًا، شدید المعارضۃ، قذع الھجاء"۔ (یعنی وہ بہت عمدہ شاعر، سخت مقابلہ باز" اور گندی ہجو لکھنے والے تھے۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت ایک ایسے سخت گیر اور ہجو گو شاعر کے زیر اثر نہیں ہو سکتی تھی۔

سو تمام محدثین و مورخین اور سیرت نگاروں نے جو لکھا ہے کہ ابو طالب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت وکفالت کی وہی درست ہے، کرمانی صاحب یہ یاد رکھیں کہ اُمتِ اسلامیہ کا اجماع کسی غلط بات پر کبھی نہیں ہوا ہے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اس بارے میں حجت ہے۔ لا تجتمع اُمتی علی الضلالۃ اور اپنے نبی پاک کی سیرت کے معاملے میں اُمتِ اسلامیہ غلط اور گمراہ کُن باتوں میں کبھی مبتلا نہیں ہوئی۔

پھر کرمانی صاحب کو صحیح بخاری میں حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ سے مروی وہ حدیث بھی ذہن میں رکھنی چاہیے جو "باب قصۃ ابی طالب" میں مذکور ہے، جس کے الفاظ

ہیں: حدثنا العباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ قال للنبی صلی اللہ علیہ وسلم ما اغنیت عن عمك فانہ کان یحوطك و یغضب لك، قال: ھو فی ضحضاح من نار، ولولا انا لکان فی الدرك الاسفل من النار (صحیح البخاری جلد ۷، ص ۲۵ طبعۃ مکتبۃ الشعب، القاھرۃ)

اسی طرح کی ایک دوسری حدیث اسی باب میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے۔ جب کہ زبیر بن عبد المطلب کے بارے میں ہم کو کوئی حدیث کسی کتاب میں نظر نہیں آئی۔

معلوم نہیں جناب کرمانی نے اس موضوع پر قلم اٹھانا کیوں ضروری سمجھا، کیا واقعی یہ کوئی تحقیق طلب موضوع تھا، یا شیعہ مکتبِ فکر کی دشمنی میں ایسا کیا گیا ہے، ان کی کتاب میں بدنام زمانہ مصنف محمود احمد عباسی کی مختلف مقامات پر جو تعریف ہے، اور ان کی کتاب میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ان کے انصار کی مختلف مقامات پر جو تنقیص ہے اس سے یقین ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنے ممدوح کی طرح خواہ مخواہ ناصبیت کے مرض میں مبتلا ہیں اور اسی لیے انہوں نے ابوطالب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت وکفالت کے شرف محروم کرنے کی بے جا اور مذموم کوشش کی ہے، اور افسوس کہ انہوں نے اس کو OBJECTIVITY (موضوعیت) کا غلط نام دیا ہے۔ الحمد للہ کہ اہلِ سنت والجماعت ابوطالب کے بارے میں کسی غلو کا شکار نہیں رہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تاریخی حقائق کا بھی انکار کیا جائے اور توڑ مروڑ کر ناقص عربی عبارات کے حوالے دینے کو تحقیق کا نام دیا جائے۔ وصدق اللہ العظیم فی کتابہ العزیز، فاما الزبد فیذھب جفاءً واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض۔

اصلاح و تزکیۂ نفسِ انسانی

افادات: حضرت حسن البنا شہیدؒ — ترجمہ: منیر احمد خلیلی

اِس سے پہلے کہ ہم اصل موضوع کا جائزہ لیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس حقیقت کو واضح کر دیا جائے کہ کتاب اللہ نازل ہوئی تو اس کا اوّلین مقصد اور بنیادی غایت نفسِ انسانی کے لیے ہدایت فراہم کرنا اور رُوح و قلب کی اصلاح تھا۔ گویا قرآن کا پہلا ہدف نفسِ انسانی کا علاج کرنا ہے تاکہ یہ پاکیزگی اور تزکیہ و تہذیب سے آراستہ ہو جائے، اس کی سمت درست ہو جائے اور اس میں معاملات اور اشیاء کو حقائق کے آئینے میں دیکھنے اور پرکھنے کی صلاحیت اجاگر ہو جائے۔ یہاں تک کہ ہر انسان تعلیم و تربیت پا کر حق، جمال، عدل اور تقدیر کو اپنی منزل ٹھہرا لے۔

قرآنِ کریم جب آیا تو نفسِ انسانی کو عوارض اور بگاڑ سے بچانے کے لیے آیا تھا۔ اِس کے پیشِ نظر بنیادی کام فرد کا علاج تھا۔ نظم و اجتماع کا معالجہ اس میں موجود ضرور ہے، لیکن اس کا پہلا ہدف فرد کی اصلاح ہے۔ اس کا اوّلین مخاطب انسان ہے، معاشرہ نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جب فرد کی اصلاح ہو جاتی ہے تو معاشرہ سُدھر جاتا ہے۔[1]

[1] محض چند (مثلاً دس فیصد) افراد کے سُدھرنے سے معاشرہ آٹومیٹک طور پر نہیں سُدھر جاتا، بلکہ سُدھرنے والے افراد کو دعوتِ اصلاح کا جہاد جاری رکھنا پڑتا ہے (باقی بر صفحہ آئندہ)

فرد بگاڑ کا شکار ہو جائے تو اجتماعی دائروں میں بھی فساد پھیل جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اجتماعیت کے اصول اور زاویے اگر درست بھی ہوں، فرد کا نقطۂ نظر، فرد کا مطمحِ نظر، فرد کا باطن اور فرد کے احساسات و خیالات درست نہ ہوں تو محض اصول اور زاویے درست ہونے سے معاشرہ اصلاح و تعمیر کے رُخ پر سفر نہیں کر سکتا۔

ایک عادل قاضی ظالم حکمران کے بنائے ہوئے قوانین میں سے بھی عدل و انصاف کی راہ نکال لیتا ہے بشرطیکہ اس کا اپنا نفس نیک ہو، اس میں عدل کا مخلصانہ جذبہ ہو، اور وہ انصاف پسند ہو۔ لیکن اگر قاضی کا نفس فساد زدہ ہو اور وہ خواہشاتِ نفس کا غلام بن جائے تو قانون خواہ کتنا ہی رُوحِ عدل سے معمور ہو، وہ ایسی راہیں ضرور تلاش کرے گا جو اس کے شریرنفس کے تقاضے کی تکمیل تک اُسے پہنچا دیں۔ اس لیے اللہ کی کتاب کی غایتِ اولیٰ اور ہدفِ اوّل نفسِ انسانی کی تہذیب و تربیت ہے۔ یہی وہ اوزار ہے، جسے مقاصدِ شر یا مقاصدِ خیر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

اسی لیے قرآن نے نفسِ انسانی کو بڑی اہمیت دی اور اس کی اصلاح و تعمیر کر کے اسے اس قابل بنانے کا بیڑا اٹھایا کہ یہ حق و انصاف اور جمال و لطافت کو چاہنے لگے اور اس کے لیے بدی، بُرائی اور باطل ناپسندیدہ ترین چیزیں بن جائیں۔ یہاں تک کہ وہ ایسا نفس بن جائے جس میں فضل و شرف اور خیر کے سوا کچھ نہ رہے۔ ملاحظہ ہو:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

اور اپنی قوتوں کے ذریعے خود معاشرے کے اختیار کردہ اور معاشرے کے مطالبہ کردہ اور حکومت کے لازم کردہ اور ذرائع ابلاغ کے عام کردہ مفاسد کے خلاف لڑنا پڑتا ہے۔ اس دعوتی و اصلاحی مہم کے بغیر اگر یہاں وہاں تقویٰ کے پیکر موجود ہو جائیں تو محض ان کی برکت سے الحاد پسند، انحراف پسند اور فساد پسند لوگ درست نہیں ہو جائیں گے۔ فرد کی درستی کی تکمیل یہ ہے کہ وہ دعوت و اصلاح کا کام کرے۔

قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰهَا۔ (الشمس - ۷-۹)

ترجمہ: اور اس ذات کی قسم جس نے اُسے (یعنی نفس کو) ہموار کیا، پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی، یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔

جماعت اور معاشرہ کی اصلاح کا دارومدار اصلاحِ نفس پر ہے اور معاشرے میں فساد پھیلنے کا سبب بھی فسادِ نفس ہے کہ بگاڑ اور بدی پہلے نفوسِ انسانی میں جڑ پکڑتی ہے اور یہ اللہ کی اُس سنت کے مطابق ہے۔ (۱) کہ "وہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرزِ عمل کو نہیں بدل دیتی۔ اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے"۔ (انفال-۵۳) - (۲) حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی"۔ (الرعد-۱۱)

قرآن نفسِ انسانی پر ہر زاویے اور پوری اہمیت و تفصیل کے ساتھ توجہ مبذول کرتا ہے۔ اس میں حق اور خیر کی محبت جاگزین کرنا اور شر اور فساد و بگاڑ سے نفرت پیدا کرتا ہے اور مسلسل اُسے حسن و شرف اور کمال کی سمت میں آگے بڑھاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے قرآن دو ذرائع اختیار کرتا ہے۔ پہلا ذریعہ یہ ہے کہ نفسِ انسانی کو انتہائی مکرم و محترم اور پاکیزہ قرار دے کر اس کی نسبت اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف کرتا ہے:

اُسے کہو: یہ روح میرے رب کے حکم سے آتی ہے، مگر تم لوگوں نے علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے" (بنی اسرائیل: ۸) ۲- "اور میں نے اس میں اپنی روح سے کچھ پھونکا" (الحجر-۲۹) - ۳- "اور بے شک ہم نے بنی آدم کو مکرم و محترم کیا"۔ (بنی اسرائیل ۷۰)

دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ وہ نفسِ انسانی کا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم کر دیتا ہے جس کے نتیجہ میں اُسے اپنے رب کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے اور یہ براہ راست اور مستقل طور پر اپنے پیدا کرنے والے کی نگاہ اور نگرانی میں آجاتا ہے۔ (۱) ہم نے انسان کو پیدا کیا، اور اس کے دل میں اُبھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں۔ ہم اُن کی رگِ گلو سے بھی زیادہ ان کے قریب ہیں (ق: ۱۶) - (۲) اے نبیؐ تم جس حال میں بھی ہوتے ہو اور

قرآن میں سے جو کچھ بھی تم سُناتے ہو اور لوگو، تم بھی جو کچھ کرتے ہو اس سب کے دوران میں ہم تم کو دیکھتے رہتے ہیں (یونس : ۶۱)۔ ان دو ذریعوں سے قرآن نفسِ انسانی کو رفعت و عظمت سے نوازتا ہے۔ اس کو اس کی شان اور بلندی کا احساس دلاتا ہے۔ اور اسے دائمی طور پر حق تعالیٰ کی نگاہِ لطف و کرم میں رکھتا ہے جس سے نفسِ انسانی کو اپنی قدر و قیمت کا احساس ہوتا رہتا ہے۔

یہی ضابطہ منہجِ اسلامی میں اصلاح و تعمیر اور تزکیہ و تطہیر کا سنگِ میل ہے اور یہیں سے اسلامی تعلیمات کے فہم و ادراک کا آغاز ہوتا ہے۔ درحقیقت نفسِ انسانی کی اصلاح ہی انسانی زندگی کے جملہ گوشوں اور حیاتِ اجتماعی کے تمام پہلوؤں میں اصلاح کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا آیاتِ قرآنی سے ثابت ہوتا ہے اور سنتِ نبوی میں بھی تفصیل سے اس کا ذکر ہے۔ ملاحظہ ہو: فرمایا: "نیکی حُسنِ خلق ہے اور گناہ کی نشانی یہ ہے کہ اس سے تمھارے دل میں ایک خلش سی محسوس ہوتی ہے اور تم اس عملِ گناہ کا لوگوں پر ظاہر ہونا پسند نہیں کرتے۔ اپنے عمل کے بارے میں حسن و قبح کا فیصلہ اپنے دل سے طلب کر۔

یاد رکھو، تمھارے بدن میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، جب وہ درست ہو جاتا ہے تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے اور جب اس میں فساد پیدا ہو جاتا ہے تو سارا بدن فساد زدہ ہو جاتا ہے۔ خیال رہے وہ تمھارا دل ہے۔"

نفس کی اصلاح و تزکیہ کے بعد اجتماعی اور اداری اور تنظیمی زندگی میں صحت مند اقدار کی ترویج اور تعمیر و اصلاح کی باری آتی ہے۔ نفس کی اصلاح ہو چکنے پر ان دائروں اور منہجوں کا تعین ہوتا ہے، حدود کا پتہ چلتا ہے اور زندگی کی گاڑی کا ہر پرزہ ٹھیک ٹھیک کام کرنے لگ جاتا ہے۔ اصلاحِ نفس سے اصلاحِ اجتماع کی طرف بڑھنا ایک فطری تدریجی اور طبیعی طریقہ ہے۔ آسمانی قانون اور انسان کے تراشیدہ نظام میں یہی فرق ہے کہ اول الذکر نفسِ انسانی کی جڑوں اور گہرائیوں میں داخل ہو جاتا ہے اور ہر شخص کے نفس ہی کو اس پر چوکیدار بنا دیتا ہے، جب کہ انسان کے بنائے ہوئے تمام نظاموں میں اصلاح کے لیے نفسِ انسانی سے آغاز کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظام جرائم اور بگاڑ کا قلع قمع کرنے میں ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔

رسائل و مسائل

ایک جانور میں قربانی و عقیقہ کا اشتراک

سوال: ایک مسئلہ درپیش ہے۔ امید ہے آپ اس سلسلہ میں قرآن و حدیث کی روشنی میں بذریعہ ترجمان القرآن جواب مرحمت فرمائیں گے۔

مسئلہ یہ ہے کہ عیدالاضحٰی کے موقع پر مسلمان بھیڑ، بکری، گائے، اونٹ وغیرہ ذبح کرتے ہیں۔ گائے میں سات حصے کیے جاتے ہیں۔ یہاں عام طور پر جب کسی بچے یا بچی کا عقیقہ کیا جاتا ہے تو بھی گائے میں سات حصے کیے جاتے ہیں۔ یعنی ایک گائے سے تین بچوں اور ایک بچی کا عقیقہ کیا جاتا ہے۔ اب چند دن پیشتر ایک مولوی صاحب نے بتایا کہ عقیقہ کے لیے ایک جان قربان کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے گائے میں سات حصے نہیں کیے جا سکتے۔ ایک مرد کے لیے دو بکرے، یا دو گائے یا بچھڑے ذبح کیے جائیں۔ اس سلسلے میں قرآن و حدیث و فقہ کی روشنی میں وضاحت فرما دیں تو نوازش ہوگی۔

جواب: آپ کا استفسار ملا۔ جواب درج ذیل ہے:

علماء احناف کا عام فتویٰ یہ ہے کہ قربانی اور عقیقہ کے احکام یکساں ہیں اور قربانی اگر گائے، بیل، اونٹ کی ہو تو اس کے بعض حصوں میں قربانی کی اور کچھ حصوں میں عقیقہ کی نیت کرنا جائز ہے اور قربانی و عقیقہ دونوں ادا ہو جائیں گے۔ یہ مسئلہ کتب فقہ حنفیہ ردالمحتار شامی اور دوسری کتابوں میں درج ہے اور اسی حوالے سے اُردو فتاویٰ

میں بھی موجود ہے۔ مثلاً فتاویٰ دارالعلوم دیوبند جلد اول ص ۷۱۶ میں ایک سوال بعنوان "عقیقہ کے چند احکام" کا جواب ہے:

حکم قربانی و عقیقہ یکے است یعنی در اضحیہ شرکت عقیقہ صحیح است و یک بقر از ہفت اطفال عقیقہ کردن رواست۔

"قربانی اور عقیقہ کا حکم ایک ہی ہے، یعنی قربانی میں عقیقہ کی شرکت صحیح ہے اور ایک گائے کا سات بچوں کی طرف سے عقیقہ کرنا روا ہے"۔
(آگے شامی، کتاب الاضحیہ کی عربی عبارت ہے)۔

بہارِ شریعت، مولانا محمد امجد علی صاحب رضوی، جلد ۱۵، قربانی کے جانور کے بیان میں فرماتے ہیں:

مسئلہ: "یہ ضروری نہیں کہ تقرب ایک ہی قسم کا ہو، مثلاً سب قربانی ہی کرنا چاہتے ہیں، بلکہ اگر مختلف قسم کے تقرب ہوں، ہر صورت میں قربانی جائز ہے...... قربانی اور عقیقہ کی بھی شرکت ہو سکتی ہے کہ عقیقہ بھی تقرب کی ایک صورت ہے"۔ (ردالمحتار)

ممکن ہے جن عالمِ دین نے آپ کو مسئلہ بتایا ہے، وہ اہل حدیث ہوں اور اس مسلک کے علماء کا فتویٰ وہی ہو۔ میں اس بارے میں پورے یقین اور تحقیق کے ساتھ سرِدست کچھ کہنے سے قاصر ہوں، لیکن مولانا میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے فتاویٰ نذیریہ جلد سوم صفحہ ۲۵۳ پر قربانی و عقیقہ کے احکام میں فقہائے حنفیہ کا استدلال جس طرح بلا اظہارِ اختلاف نقل فرمایا ہے اور اس سے پہلے اس قول کی تصویب فرمائی ہے کہ "جمیع احکامِ عقیقہ کے مثل احکام قربانی کے ہیں"۔ اِس سے میں یہی سمجھ سکا ہوں کہ انہیں بھی حنفی فتویٰ سے اتفاق ہے، واللہ اعلم۔ لیکن علمائے حنفیہ کا فتویٰ بلاشبہ یہی ہے کہ جن جانوروں کی قربانی میں حصے ہو سکتے ہیں، وہ حصے قربانی کے بھی ہو سکتے ہیں اور عقیقہ کے بھی اور عقیقہ و قربانی کا اشتراک بھی اس جانور میں جائز ہے۔

(غلام علی)

مطبوعات

دو مسافر، دو ملک | مولفہ حکیم محمد سعید و مسعود احمد برکاتی صاحبان - سفر نامۂ فرانس و انگلستان مرتبہ: مسعود احمد برکاتی - ناشر: ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، کراچی - (ناظم آباد) صفحات یکصد، دبیز آرٹ کارڈ کا مصور و رنگین سرورق - قیمت: -/۱۲ روپے

امریکہ و یورپ کا تھوڑا سا سفر میں نے بھی کیا، بہت سے سفرنامے پڑھے، مگر اس سفرنامے کی نوعیت امتیازی ہے - اس کے مواد اور اندازِ بیان میں بچوں کی ضروریات کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بچوں کی حق ماری جو عرصۂ دراز سے ہوتی رہی ہے - اس کے پیش نظر جو خدمت بھی کسی گوشے سے انجام دی جائے وہ بڑی قابلِ قدر ہے - خدا کا شکر ہے کہ یہ سفرنامہ بچوں کے لیے اس مروجہ نقالانہ نہج پر نہیں لکھا گیا کہ جس میں مغرب کی ایسی تصویر بنا کر آئینہ کی طرح لٹکا دی جاتی ہے کہ بچہ احساسِ کہتری کے بوجھ تلے ہمیشہ کے لیے پس جائے۔ نہ ایسا ہے کہ جدید تمدن کے مادہ پرستانہ لباس میں انسانیت کو حیوانی سطح پر دکھا کر بچے کو اندھی خواہشات کی سواری اور اخلاقی قدروں سے بیگانہ کر دیا جائے - اس سفر کے دو مسافروں کا ذکر سامنے آتے ہی اقبال کا شعر یاد آجاتا ہے کہ:

کاروانِ ایں دو بینائے وجود   بر کنارِ مشتری آمد فرود

سفرنامہ پڑھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ دو محبِ وطن پاکستانیوں کا سفرنامہ ہے جو مسلمان ہیں - وہ قوم کے بچوں کو کتاب کے آئینے میں تمام اہم مناظر، ادارے، عمارتیں، شخصیتیں، ہوٹل، ٹیکسیاں، ہوائی اڈے، زیرِ زمین ریلوے، بازار، پارک، رنگ برنگے پھول، لوگوں کا رہن سہن، اُن کی عادات و اطوار اس طرح دکھاتے ہیں جیسے کسی میلے میں کوئی فن کار

بڑے سائز کی سیر بین دکھا رہا ہو — "سبز گنبد دیکھ! — دلی کا لال قلعہ دیکھ! — غوث الاعظمؒ کا مزار دیکھ کر — کربلائے معلّی دیکھ! — مسجد کا نپور دیکھ".....

ص ۹ پر ہے کہ "اس کے جنت ہونے میں کیا شبہ ہے"۔ ایک تو اس سے یہ خیال بچوں میں پیدا ہو سکتا ہے کہ جنت کا تعلق آخرت سے ضروری نہیں۔ اس دنیا میں جہاں اسباب راحت جمع ہو جائیں وہیں جنت ہے۔ دوسرے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ مغربی معاشرہ کی ترقیات اور دلکشیوں کے پیچھے جو تاریکیاں اور غلاظتیں ہیں اُن سے وہ بے خبر رہ جانے کی وجہ سے یہ سمجھیں کہ بڑی بے عیب مخلوق اور اس کی تہذیب ہے۔ بس وہ بنا اُن کا غلام! آپ نے مغربی زندگی کی چکا چوند کو بھی دیکھا، ایک خاص دائرے میں وہاں کا حسنِ خلق بھی دیکھا، مگر اس کے پیچھے مغربی جانوریت بھی دیکھی اور معاشرے کی غلاظتیں بھی دیکھیں۔ کسی شخص یا معاشرے یا تہذیب کے متعلق بچوں کو معلومات دی جائیں تو تصویر کے دونوں رُخ توازن سے پیش کرنے چاہئیں تاکہ اُن کے ذہن کی کشتیاں زندگی کے سمندر میں کبھی ڈانواں ڈول نہ ہوں۔

برکاتی صاحب تنقید نگار کے قلم کی ٹیڑھی ترچھی لکیروں کی رعایت ضرور دیں گے کیونکہ اس کی ذمہ داری بڑی نازک ہے۔

مارشل لا سے مارشل لا تک | از مرحوم سید نور احمد۔ ناشر: دار الکتاب ۲۰/۱ ریٹی گن روڈ، لاہور ۲۔ صفحات: سوا پانچ سو، مجلد قیمت: ۱۲۵/- روپے۔

سید نور احمد مرحوم نے سول اینڈ ملٹری گزٹ کے رپورٹر کی حیثیت سے آغازِ کار کیا۔ پھر وہ حکومت پنجاب کے محکمہ تعلقاتِ عامہ میں شریک ہو گئے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد پنجاب کے محکمہ پریس اینڈ انفارمیشن کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔

یہ کتاب (۱۹۱۹ء سے اکتوبر ۱۹۵۸ء تک) ایک ایسے شخص کی لکھی ہوئی تاریخ ہے جو واقعات کے بہاؤ کا عینی شاہد تھا۔ گو سرکاری ملازمت کا خفیف سا اثر بھی بسا اوقات تاریخی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں دخل انداز ہوتا ہے اور ایسے مؤرخ کا قلم سیاسی احتیاط پسندیوں

کے جنگلوں کے درمیان چلتا ہے۔ مگر یہ مطالعۂ تاریخ اچھا خاصا واضح اور دلچسپ اور بیان کے لحاظ سے ہموار اور پُرسکون قسم کا ہے۔

ہماری چالیس سالہ تاریخ کی اس کتاب میں ہندو مسلم اتحاد — شدھی اور تبلیغ کی ٹکر۔ گاندھی کا ۲۱ روزہ برت۔ نہرو رپورٹ۔ سائمن کمیشن۔ بھگت سنگھ۔ علامہ اقبال کا خطبۂ الٰہ آباد۔ شہید گنج کا ہنگامہ اور مجلس احرار۔ جناح سکندر پیکٹ۔ کرپس تجاویز۔ کابینہ مشن پلان۔ ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ۔ ریڈکلف ایوارڈ۔ کشمیر کا الحاق۔ خارجہ پالیسی کے سات سال۔ لیاقت علی کا زمانہ — فوجی انقلاب ۱۹۵۸ء۔ نہایت اہم ابواب ہیں۔ ان میں سے ہماری پوری دورِ مصائب کی جڑیں لیاقت علی خاں کے دور میں ملتی ہیں۔ مؤلف نے یہ امر تو بڑی خوبی سے دکھایا کہ قائداعظمؒ کے بعد کاٹ چھانٹ کی سیاست کس زور سے شروع ہوئی اور کیسی کیسی کشتیاں اور پیچ ہوئے اور آئندہ کے لیے محاذ آرائیاں بن گئیں، لیکن مؤلف نے ایک معاملے میں بڑی کوتاہی دکھائی ہے، وہ ضروری مواد اور اسٹوری سامنے لاکر مبرہن حقیقت واضح نہیں کر سکے کہ افسر عمل کو سیاست میں استعمال کرنے اور انتخابات میں دھن دھونس اور دھاندلی کا استعمال کرنے کے لیے جناب لیاقت نے کیا خدمات سرانجام دیں۔ آج اگر کوئی شخص یہ کہے کہ خان مرحوم کی نیت بڑی نیک تھی، مگر عملی لحاظ سے ایسی کارروائیاں ہوئیں کہ جنہوں نے نظامِ انتخابات اور بیورو کریسی دونوں کو مستقلاً کرپٹ کر دیا۔ اس پہلو سے مؤلف کی کوتاہی خاصی کھٹکی۔ ویسے بہ حیثیت مجموعی کتاب بڑی اہم اور دلچسپ ہے اور تعلیمی لحاظ سے بھی اس کا مقام ہے۔ تاریخ نویسی کا شرمناک حد تک جو قلیل سا کام پاکستان میں ہوا ہے اس میں اس کتاب کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہے گی۔

قابلِ افسوس امر یہ ہے کہ معلوم نہیں، سابق ایڈیشن سے فوٹو کاپی لی گئی ہے یا کتابت خراب ہے اور اس کے ساتھ کاغذ بھی گھٹیا ہے، ان وجوہ سے کتاب کی وقعت کو نقصان پہنچا ہے۔ ہمارے ناشرین کو چاہیے کہ کتابوں سے منفعت ضرور حاصل کریں، مگر قاری کو اچھا موادِ مطالعہ بہترین ظاہری پیرائے میں مہیا کریں۔ ادھ کچرے کام کرنے کا سلسلہ بند ہونا چاہیے۔ کوئی نجوم یا فالنامے یا خواب نامے یا سجھارتوں اور

معمول کی کتاب ہوتی تو آپ جو چاہے کرتے، مگر خدا کے بندو! یہ تو تاریخ ہے، ہماری تاریخ، ہماری تصویر، ہمارا چہرہ ـــ اور اسے پیش کرنے والی شخصیت کوئی نکھٹو ہی پر بیٹھنے والا آدمی نہ تھا، نور احمد کی معروفِ عام شخصیت تھی، جس کو علم بھی حاصل تھا اور قلم بھی!

اُردو ڈائجسٹ (رحمۃ للعالمینؐ نمبر)	مدیر مسئول: الطاف حسن قریشی - مقامِ اشاعت: ۲۱، ایکڑ اسکیم، سمن آباد، لاہور ۲۵ - ۳۷۴ صفحات (مع اشتہارات) - قیمت فی

پرچہ ۲۱/- روپے - چندہ سالانہ بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۰/- روپے -

اُردو ڈائجسٹ کا اپنا ایک مقام برسوں سے بنا ہے اور اس کا ہر عام شمارہ بھی اہم ہوتا ہے۔ لیکن سال میں دو تین بار وہ جو خاص نمبر شائع کرتا ہے، ان کی قدر و قیمت خاصی زیادہ ہوتی ہے۔ اس وقت رحمۃ للعالمینؐ نمبر (حصّہ دوم) ہمارے سامنے ہے۔ اس نمبر کی قدر و قیمت موجودہ تاریک اور کربناک ماحول کی وجہ سے بہت بڑھ جاتی ہے۔ قوم جن انسانیت کش اور ایمان شکن مظالم اور پستیوں اور سازشوں اور فتنوں سے گذر رہی ہے، ان میں اگر اس کے سامنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی اور سیرت اور تعلیمات کی کوئی جھلک لائی جا سکے تو شاید وہ کچھ نہ کچھ لوگوں پر اپنا اثر ضرور ڈالے گی۔ اُمید ہے کہ اُردو ڈائجسٹ کے اس نمبر سے یہ برکت حاصل ہوگی۔

مضامین کو پانچ حصّوں: ۱- اسلامی نظامِ مملکت۔ ۲- اُصول سیاست، نظامِ عدالت اور اندازِ سفارت۔ ۳- دورِ رسالت میں صلح و جنگ کے مثالی واقعات۔ ۴- ایک عالِم ثناخوان آپ کا (منظوم ہدیۂ عقیدت)۔ ۵- سیرتِ رسولؐ کے کچھ اور دلآویز گوشے ـــ میں بانٹا گیا ہے۔ علاوہ ازیں "مستقبل کے تیور" (اداریہ از الطاف قریشی) اور "تعارف و تبصرۂ کتب" (از طالب ہاشمی و ادریس صدیقی) بھی زینتِ اوراق ہیں۔ سرورق کے لیے شاندار ڈیزائن، خطاطی از فریدالدین احمد، رنگ کاری از عنایت اللہ!

بدعت کی حقیقت اور اس کی اقسام | مؤلف: شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ۔ مترجم: معراج محمد بارق
ناشر: قدیمی کتب خانہ مقابل آرام باغ روڈ کراچی۔ صفحات: ۲۱۶۔ کاغذ سفید، مضبوط جلد سنہری ڈائی والی قیمت: ۳۹/- روپے۔

علامہ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے لیے میرے دل میں دو وجہوں سے کشش ہے: ایک یہ کہ آپ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے دینی مضامین کو عوام تک پہنچانے کے لیے اردو نثر کا بہترین مؤثر اسلوب اختیار کیا۔ اس بنا پر میرا تو یہ خیال ہے کہ شہیدؒ موصوف کو تذکرہ نثر نگارانِ اردو کی صفِ اوّل میں جگہ ملنی چاہیے۔ دوسری وجہ ان کے وہ کارنامے ہیں جو سیّد اسمٰعیل شہیدؒ کی قیادت کے تحت اقامتِ دین کے لیے جہاد میں دکھائے اور پھر جو مخالفتیں انگریز اور انگریزوں کی بنائی ہوئی فضا میں پروان چڑھنے والے دینی اور غیر دینی لوگوں نے کیں اور شہیدؒ بلکہ پوری تحریک مجاہدین اور اس کے ساتھ وہابیت اور ملا ازم کو ملا جلا کر ایسی غبار آلود فضا تیار کر دی کہ کچھ دیکھنا سمجھنا لوگوں کے لیے ممکن ہی نہ رہا۔ پھر ستم یہ توڑا گیا کہ فرقہ بندی کے معرکہ آراؤں نے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی شخصیت کو اتنا متنازع بنا دیا اور بعض جزوی مسائل کو وجہِ شورش و ہنگامہ بنا کر شاہ صاحب کی گراں قدر علمی خدمات سے قوم کو دُور ہٹا دیا۔

میں تمام فرقوں کے علماء کے لیے اپنے دل میں گنجائش رکھنے کی وجہ سے شاہ صاحب کے لیے بھی کھلا ذہن رکھتا ہوں۔ کوئی چیز وجہِ اختلاف ہوگی تو اُس سے اختلاف کروں گا لیکن اور بے شمار سرمایۂ علم جو قیمتی ورثہ ہے اُس سے کیوں فائدہ نہ اُٹھاؤں۔

یہ کتاب شاہ صاحب کی کتاب "ایضاح الحق الصریح" کا اُردو ترجمہ ہے۔ اس پر محمد یوسف بنوری مرحوم کی تقریظ ہے۔ شاہ صاحب کے سوانح کا خلاصہ درج ہے۔

کتاب اس لمبی حدیث سے متعلق ہے جس میں آتا ہے کہ: "وَاِیَّاکُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ"۔ اِس حدیث کا ایک خاص حصہ خطباتِ جمعہ میں پڑھا جاتا ہے تاکہ بار بار یاد دہانی ہوتی رہے۔ خلاصہ یہ کہ دین میں کوئی ایسی نئی بات نکالنا جس کا سراغ قرآن، حدیث اور سنتِ رسولؐ و سنتِ خلفائے راشدین تک میں نہ ملے اور نہ اُس کی کوئی نظیر ملے

تو ایسی چیز کو جزو دین قرار دینا یا عبادات اور شرعی حقوق و فرائض میں اس کا اضافہ کر دینا بدعت ہے جو یکسر ناجائز ہے۔ یعنی ایسی کوئی چیز اختیار نہ کرنی چاہیے جو "ما انا علیہ واصحابی" کی کسوٹی پہ پوری نہ اُترے۔

شاہ صاحب کا کمال یہ ہے کہ حدیث میں سے بدعت کی بحث سے متعلق ایک ایک لفظ یا اصطلاح کو الگ لے کر اس کی وضاحت کی ہے۔ ان کے بیان کو پڑھ کر بہت سے حقائق سمجھ میں آجاتے ہیں۔

بڑی اہم بحث بدعت اصلیہ اور بدعتِ وصفیہ کی ہے۔ اس کی بڑی تفصیل ہے۔ اور اسے سمجھنا ضروری ہے۔

پھر شاہ صاحب کی اس کتاب میں " فائدہ اوّل" کے زیرِ عنوان بتایا گیا ہے کہ بدعتِ حقیقیہ میں کون سے امور داخل ہیں، پہلے اور دوسرے مسئلے میں۔ پھر ما بعد جو چیزیں شاہ صاحب نے بیان کی ہیں کاش کہ اُن کے لکھنے کی گنجائش ہوتی۔ پھر " فائدہ دوم" میں اُن امور کا بیان ہے جو بدعتِ حکمیہ میں داخل ہیں۔ عجیب معلومات ہیں۔ " فائدہ سوم" میں اُن باتوں کا بیان ہے جو بدعت سے مشابہ ہیں، مگر بدعت نہیں ہیں۔ پھر ایک مسئلہ ہے: " اجماع اور رواج میں فرق"۔ (کتنا اہم مسئلہ ہے!)۔ دوسرے اور تیسرے اور چوتھے مسئلہ کی بھی اہمیت ہے۔ فصلِ ثانی کے تحت " بدعت کا حکم" کے عنوان سے مزید وضاحت ہے۔ کتاب کے مباحث ایسے ہیں کہ اس تعارف نگاری کے بعد ایک بار پھر غور و فکر کے ساتھ اسے پڑھنے کی خواہش ہے۔

دِراسَۃٌ فِی البناء الحضاری	مولفہ: ڈاکٹر محمود محمد سفر۔ ناشر: محکمہ شرعیہ و شئون الدینیہ، قطر۔ کاغذ، طباعت، سرورق خوب۔

یہ کتاب الامۃ سیریز کی ۲۱ ویں کتاب ہے۔ مؤلف نے ملتِ اسلامیہ کے مرض کی تشخیص یہ کی ہے کہ ہمارا مرض دین سے دُوری، دین و دُنیا کی تفریق اور عیش کوشی کی زندگی گذارنا ہے۔

مزید یہ کہ ڈاکٹر صاحب نے مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کی خرابیوں، ان کے معاشی مسائل پر بھی بحث کی ہے اور درستی احوال کے لیے تدابیر بیان کی ہیں، ان کا انداز رجائیت پسندانہ ہے۔ وہ ایمان وعمل صالح کی بنیاد پر نشاۃ ثانیہ کے ظہور کا عزم ولیقین رکھتے ہیں۔ وہ تہذیبی طور پر فرد کو بنیادی اکائی سمجھتے ہوئے، اصلاحِ فرد، اصلاحِ خانہ اور اصلاحِ معاشرہ کے خطوط پر سوچتے ہیں۔ انہوں نے مختصر پیغام اس مشہور شعر کے ذریعے دیا ہے۔

سہ أن تعمل لدنیاک کأنک تعش أبداً
أن تعمل لآخرتک کأنک تموت غداً

تو دنیا کے معاملے میں اس طرح محنت کر، گویا تجھے دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے۔
تو اپنی آخرت کے لیے اس طرح سعی وجہد کر، گویا تجھے کل ہی مرجانا ہے۔

ص ۸۰ پر انگریزی کا ایک لفظ HAND غلط چھپا ہے، HARD ہونا چاہیے۔

اربابِ علم وکمال اور پیشۂ رزقِ حلال از جناب مولانا عبدالقیوم حقانی۔ پیش لفظ از جناب مولانا سمیع الحق مدیر الحق۔ ناشر: موتمر المصنفین، دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک، ضلع پشاور (پاکستان)۔ صفحات: ۳۰-۲۲۹، سفید کاغذ، خوبصورت مجلد سنہری ڈائی۔ قیمت: ۵۱/- روپے۔ ملنے کے تین پتوں میں سے ایک۔ مکتبۂ مدنیہ، ۱۷۔ اردو بازار، لاہور ۲۔

یہ کتاب فی الواقع محترم مولانا سمیع الحق صاحب کے الفاظ کے مطابق "مصنف نے جدید طرز کی نئی اور اچھوتی طرزِ تحریر سے جس طرح اپنے موضوع کی وضاحت، اہمیت اور اس سلسلے میں سلفِ صالحین کے کردار کی توضیح کی ہے، وہ تو بس انہی کا حصہ ہے" (ص ۷)

ملتِ اسلامیہ کے لیے یہ امر باعثِ فخر ہے کہ ہر دور میں اس کے بڑے سے بڑے علماء وحکماء دین کی خدمت کے ساتھ اکلِ حلال کے لیے پیشہ وارانہ مصروفیات رکھتے تھے۔ دوسرے مذاہب کے اکابر کی طرح انہوں نے معاشرے پر بار بننا کبھی پسند نہیں کیا۔ کوئی حلال پیشہ

اسلام میں نہ وجۂ افتخار ہے اور نہ سببِ پستی - اکلِ حلال کے لیے جائز طریق سے محنت کارِ ثواب بھی ہے اور سرمایۂ عزت بھی - گویا یہ کتاب مروجہ نسلی امتیازات اور پیشہ وارانہ قومیتوں کی بحثوں کو ختم کر دینے والی ہے -

کتاب کے آغاز میں بہت سے ذی وقار اصحابِ علم و اتقا کے تقریظی خطوط (مضامین) درج ہیں - میرا ذاتی خیال ہے کہ کسی اچھی کتاب کو اس سے بے نیاز ہونا چاہیے - دلہن کے ساتھ یہ سلوک اچھا نہیں کہ اسے دس دس جوڑے اکٹھے پہنا دیئے جائیں -

خیر، خود مجھے اس مبحث نے ایسا کھینچا کہ میں نے کئی ابواب پڑھ ڈالے - اور ابھی اطمینان سے پھر پڑھنا چاہتا ہوں -

علامہ ابوسعید عبدالکریم بن محمد السمعانی نے کتاب الانساب کے نام سے ایک ہزار چھ صفحات کی ایک کتاب میں ذی وقار علمائے سلف کو پیشوں کے اعتبار سے الگ الگ نمایاں کیا ہے -

مثلاً روغن ساز اور روغن فروش علماء کا تذکرہ ، درزی کا کام کرنے والے علماء کا بیان ہے ، ریشم اور پارچہ فروشی کرتے والوں کا ذکر ہے ، قصابوں اور قلعی گروں، حلوائیوں، لوہاروں، مزدوروں، لکڑہاروں، بڑھیئوں، شکر سازوں اور شکر فروشوں میں جو علمائے دین شامل تھے، اُن کے احوال درج ہیں - چکیاں چلانے اور آٹا پیسنے، صابون سازوں، شیشہ گروں، شکاریوں اور خطاطی و کتابت کی خدمات انجام دینے والے علماء کا مذکور ہے - ضمناً ایسے اربابِ فضل و کمال کا بھی تعارف کرایا گیا ہے جو بینائی سے محروم تھے -

اس مثال سے اندازہ کر لیجیے کہ مشہور علما امام حلوائی اور امام بزدوی اور امام سرخسی تینوں حلوائیوں کا کام کرتے تھے - اسی طرح ہر پیشہ کے زیرِ عنوان بڑے بڑے اہلِ کمال کے نام آتے ہیں -

مختصراً یہ کہتا ہوں کہ یہ کتاب دینی معلومات میں بہت بڑا اضافہ کرتی ہے -

---

پاکستانی عورت کا مقام و مرتبہ | از قلم محترمہ اُمِ زبیر ۔ ناشر: خود ۔ صفحات: ۸۰
کاغذ سفید، دبیز ٹائیٹل، رنگین مگر غیر شوخ ۔ قیمت: ۱۷/- روپے

عورت جنت سے لے کر زمین کے قدیم اور جدید ہر دور میں ایک مسئلہ رہی ہے، بلکہ اُم المسائل ۔ اسے حل کرنے کی بے شمار فکری اور عملی کوششیں کی گئی ہیں ۔ مگر یہ "مسئلہ زن" وہیں کا وہیں رہا ۔ یہ کہنا بطور شکایت نہیں بلکہ سچی بات یہ ہے کہ زندگی کی ساری رونق بھی تو اسی فتنۂ بے مثال کے دَم سے ہے ۔ ورنہ آدمی کسی اور طرح پیدا ہو بھی سکتا تو جنگلی بیلوں یا بن مانسوں کی طرح مارا مارا پھرتا ۔ تمام ہنگامے ہمیشہ کے لیے سوئے رہتے ۔

مشکل یہ ہے کہ بہت سے احوال میں عورت سخت مظلوم ہوتی ہے اور اس کی بڑی پسپائی ہوتی ہے، یہاں تک کہ اس کے آنسو اس طرح ٹپکتے ہیں جیسے کچلے ہوئے باداموں میں سے روغنِ بادام ۔ اس کی مظلومیت مجبور کرتی ہے کہ اہلِ دل و نظر اس کے مسائل پر غور کریں اور کوئی حل پیدا کریں ۔

محترمہ اُمِ زبیر خود ایک خاتون ہیں، سوچنے سمجھنے والی اور لکھنے اور تقریریں کرنے والی ہیں ۔ اور عورتوں ہی کی ایک نیک نہاد تنظیم کی قائدات میں سے ہیں ۔ انہوں نے بغیر کسی فلسفیانہ لپیٹ کے صاف صاف انداز سے عورت کے دکھوں کا درماں اسلام میں تلاش کر کے اس پمفلٹ میں بیان کر دیا ہے ۔

جہاں کوئی نزاع ہو وہاں ایک حل یہ ہوتا ہے کہ ایک صد فی صد دانا اور دیانت دار اور غیر جانب دار ثالث و منصف کی تلاش کی جاتی ہے ۔ زندگی تنازعات اور اختلافات سے بھری ہوتی ہے ۔ اسلام نے ہمیشہ یہ بتایا ہے کہ سارے جھمیلوں کا حل خدا کو مالک و ہادی اور رسولؐ کو اس کا نمائندہ حَکَم تسلیم کر لیا جائے ۔ پھر جس معاملے میں رسولؐ قرآن کے لفظوں میں یا اس کی شرح میں کوئی فیصلہ دے دے تو ساری چون و چرا ختم کر کے اُسے قبول کر لیا جائے ۔ نزاعاتِ زندگی کا یہی واحد حل ہے جس کے لیے ہم سب مسلمان ہوتے ہیں ۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ اب بہت سے مسلمان ۔۔ اور خصوصاً ماڈرن مسلمان عورت ۔۔ یہی نہیں جانتی کہ مسلمان ہونا کیا ہوتا ہے ۔ اور مسلمان ہونے کے بعد کیا ماننا پڑتا ہے اور کیا چھوڑنا پڑتا ہے ۔

اندازِ بیان : از جناب عبداللہ شاکر - ناشر: ادارہ معارف اسلامی، لاہور۔
ملنے کا پتہ : المنار بک سنٹر، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ صفحات : ۲۵۶۔ سفید کاغذ، آرٹ کارڈ کا رنگین سرورق - قیمت : ۳۶/- روپے۔

پنجابی زبان کے مشہور شاعر جناب عبداللہ شاکر جو منشی فاضل (فارسی) اور ادیب فاضل (اردو) بھی ہیں، انہوں نے اپنی زندگی تعلیم و تعلم میں گذاری ہے۔ شاگردوں پر ہمیشہ محنت کرتے اور انہیں تعلیمی ترقی کی راہ پر آگے بڑھانے کی کوشش کرتے رہے۔ اردو زبان دانی کی تعلیم انہوں نے صرف نصابی حد تک نہیں دی، بلکہ شاگردوں کو وہ تحریر و تقریر کی تربیت دینے اور اچھی زبان بولنے اور لکھنے کی صلاحیت اُن میں پیدا کرنے کے لیے خاص محنت کرتے - ایسے استاد آج بہت کم ملیں گے۔ شاکر صاحب نے تقریری مقابلوں کے لیے مختلف تقاریب کے لیے اور مختلف موضوعات کے تحت بچوں کے لیے تقاریر تیار کیں - اور ان کو ادا کرنے کے لیے مشق کرائی - ان تقریروں کا محور اسلامی نظریۂ پاکستان ہے اور یہ ماحول میں پھیلے ہوئے وقت کے مسائل کو محیط ہیں۔ مڈل، میٹرک کے بچوں کے لیے خاص تحفہ ہیں اور ابتدائی مضمون نگاروں، نومشق صحافیوں، ائمہ مساجد اور مقامی لیڈروں کے لیے بہت مفید ہیں۔

وراثت مؤلف : جناب مقبول احمد برنی - فی سبیل اللہ تقسیم - پتہ : (مولف سے) مسجد بیت المکرم - المکرم اسکوائر ۵/۱ ناظم آباد، کراچی۔

مسلمانوں کی عملی زندگی جن علومِ دینیہ کی طلب گار ہے، اُن میں سے ایک میراث یا ترکے کی تقسیم کا مسئلہ ہے۔ ترکہ کے قانون کے مطابق اگر حقوق ادا نہ کئے جائیں تو دوسرے کا مال آدمی کے لیے حرام ہوتا ہے۔ اِس معاملے میں ایک پیسے کا دانستہ ہیر پھیر یا اخفا بھی سخت بڑا گناہ ہے۔

یہ علم ابتدائی دَور میں ایسی شکل میں مرتب ہوا کہ عام آدمی فائدہ نہ اٹھا سکتا تھا۔

مگراب کئی کتابیں وراثت کے اُصول و احکام، ضروری اصطلاحوں اور مقدارِ حصص کو واضح کرنے کے لیے موجود ہیں۔ ایسی ہی ایک آسان اور مختصر کتاب کا اضافہ بر نی صاحب نے کیا ہے۔ اس میں متعدد عملی نقشہ ہائے تقسیمِ حصص بنا کے دکھائے گئے ہیں۔

یوں تو اب حکومتی اور عدالتی سطح پر بھی اس قانون کی ضرورت ہے، مگر عام آدمی اور شہری کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسے کسی سے کیا لینا ہے یا کسی کو کیا دینا ہے۔

اقبالیات | مدیر: مرزا محمد منور۔ بہ اہتمام: اقبال اکیڈیمی پاکستان۔ ۱۳۹ ۔ اے، نیو مسلم ٹاؤن لاہور۔ سفید کاغذ، خوش نما ٹائیٹل۔ قیمت فی شمارہ ۲۰/- روپے۔ سالانہ ۶۰/- روپے

اقبال کی شخصیت، فکر اور سوانح کے متعلق پاکستان بھر میں یہ سہ ماہی رسالہ بہت مؤقر ہے، جس کے اردو اور انگریزی ایڈیشن باری باری شائع ہوتے ہیں۔ اس کو رتبۂ بلند دینے میں بہت بڑا حصہ پروفیسر مرزا محمد منور کا ہے، جو بیک وقت قرآن و حدیث، تحریکِ پاکستان اور اقبالؒ کے متعلق جامع شعور رکھتے ہیں۔ جولائی ستمبر ۱۹۸۸ء کا یہ شمارہ علامہ مرحوم کی پچاسویں برسی کے موقع پر تیسری خصوصی اشاعت کی صورت میں شائع ہوا ہے۔ نہایت متنوع اور اچھے اچھے مقالات کا گلدستہ سجا کر پیش کیا گیا ہے۔

آل الشیرازی فی القرن العشرین | از جناب دکتور علی الموسوی۔

ناشر: اللجنة المشرفة علی الاحتفالات السنویة۔ طہران۔ ص ۱۳۱۸۵/۳۶۱

یہ آلِ شیرازی کے سلسلہ کا بیان شیعی نقطۂ نظر سے ہے کہ اس کے بزرگوں نے بیسویں صدی میں کیا کیا حصہ ادا کیا۔ پمفلٹ عربی ٹائپ میں ہے۔ قیمت درج نہیں۔

مجلہ معلّم | مدیر اعلیٰ پروفیسر شبیر احمد منصوری (متعدد معاونین)۔ بہ اہتمام تنظیم اساتذہ پاکستان ۔ ۸۔ اسے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور۔ بدل اشتراک دس روپے۔

اسلامی نظامِ تعلیم کا علمبردار یہ مجلہ اپنے مقصد کے مطابق اچھے اچھے مضامین کا مجموعہ ہے۔ مخصوصاً وہ مضامین جو افغان تعلیمی کانفرنس پشاور یا تعلیمی کانفرنس لاہور میں پیش کئے گئے، فکر انگیز ہیں۔ "قافلہ تنظیم وادیٔ کشمیر میں" (از وقار علی کاری)۔ ایک دلچسپ روئیداد ہے۔ ایک مقالہ "قبل ابتدائی تعلیم" (عزیز احمد مرزا) ملک کے اہلِ شعور و درد کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ انہوں نے مروج ابتدائی درجوں کی درسی کتابوں کے اقتباس دے کر دکھایا ہے کہ وہ دینی اور تہذیبی لحاظ سے کتنی تباہ کن ہیں۔ آخر میں اخبار و اطلاعات کا باب ایک اچھا تجربہ ہے۔

رسالہ محنت کار | ایڈیٹر: صفدر حسن صدیقی۔ مقامِ اشاعت: ابوبکر بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن لاہور۔ قیمت فی شمارہ (۴۸ بڑے صفحات) دس روپے۔

یہ رسالہ مزدوروں کے مسائل اور تحریکات اور نزاعات سے متعلق ہے۔ اس کے تین شمارے فروری، مارچ، اپریل سامنے ہیں۔ محنت کاروں میں کیا کام کیا جائے اور کس نہج سے کیا جائے اور جو کچھ ہو رہا ہے اس میں درست کیا ہے اور غلط کیا ہے، ان سوالوں کے کئی کئی جوابات پائے جاتے ہیں۔ میں نے اسلامی نظریۂ حیات کے تحت سوچا کہ دعوت الی اللہ، تحریک اخلاقِ حسنہ اور محنت کاروں کے حقوق کی بحالی کی تحریک کو کیسے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ آخر سوچ سوچ کر عاجز ہوا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ ایک شریف و نفیس دوست کا رسالہ ہے، اس کو بس دوست کا تحفہ ہی سمجھنا چاہیے۔ باقی دنیا جانے اور اس کے جھمیلے۔

ماہنامہ آموزگار | مدیر اعلیٰ: اکبر رحمانی۔ مقامِ اشاعت: کاشانۂ سہیل، ۳۷ بھوانی پیٹھ، جلگاؤں ۰۰۱ ۴۲۵ (بھارت)، قیمت فی شمارہ ۳/۔ روپے سالانہ ۳۵/۔ روپے (پاکستان اور دوسرے ممالک کے لیے شرحیں الگ)۔

بہت مختصراً میں یہ لکھنا چاہتا ہوں کہ معمولی کاغذ پر کمزور طباعت کے ساتھ سامنے آنے والا یہ رسالہ مجھے بہت عزیز ہے۔ بھارت کی تعلیمی پالیسیاں اور قوانین، اردو زبان کا مقام، نصابی کتب کے مسائل، طلبہ کی ذہنی ضروریات، تدریسی رہنمائی وغیرہ موضوعات پر اچھے اچھے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ کاش کہ پاکستان کے تعلیمی رسائل میں سے بھی کوئی تدریسی امور پر خاص توجہ دے۔

ادارے کی چند مطبوعات بھی بہت اچھی ہیں۔ علاوہ ازیں "ادب اطفال نمبر" اور دیگر خاص نمبر۔

بقیہ عورت کی حکمرانی قرآن و سنت کی روشنی میں

مگر اسمبلیوں کی رکنیت کے ممنوع ہونے کے دلائل موجود نہیں ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ سربراہ حکومت کی ذمہ داریاں وسیع ہیں۔ وہ پورے ملک کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ صرف رائے دینے والا اور بحث و تحقیق کرنے والا نہیں ہوتا۔ اور اسمبلیوں کے ارکان کی ذمہ داریاں محدود ہوتی ہیں۔ اس واضح فرق کے ہوتے ہوئے کس طرح پورے ملک کی حکمرانی کو اسمبلیوں کی رکنیت پر قیاس کیا جا سکتا ہے؟ باقی رہی یہ بات کہ اسمبلیوں کو حکومت کے عزل و نصب کے اختیارات حاصل ہیں تو عزل و نصب اور چیز ہے اور عملاً حکمرانی کرنا اور ملک کا نظم و نسق چلانا ایک دوسری چیز ہے۔ پھر یہ بات بھی مدنظر رہنی چاہیے کہ وزیراعظم یا صدر مملکت کے عزل یا نصب کا اختیار اسمبلیوں کے ہر رکن کو انفرادی طور پر حاصل نہیں ہے، بلکہ یہ اختیار ارکان کے مجموعے کو حاصل ہے۔ ہاں! ووٹ دینے اور رائے دینے کا حق ہر رکن کو حاصل ہے لیکن یہ تو ضروری نہیں ہے کہ جو شخص ووٹر بن سکتا ہو، وہ حکمرانی بھی کر سکے۔ شریعت میں رائے دہی کے لیے مرد ہونا شرط قرار نہیں دیا گیا مگر سربراہی کے لیے مرد ہونا لازم قرار دیا گیا ہے۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

ستمبر سنہ ۱۹۸۶ء